قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا سترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

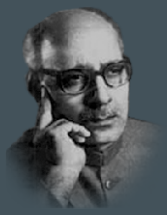
لاہور

جنوری 2020ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے







ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢

تم جس ہدایت کی آرزُو رکھتے ہو (1:5) وہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے (15:9) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے، اور نہ کوئی نفسیاتی اُلجھن۔ یہ ضابطۂ قوانین، سفرِ زندگی میں، اُن لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔

(سورۃ البقرہ:2، مفہوم القرآن از پرویز)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جنوری 2020ء

جلد 73 | شمارہ نمبر 01

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قانون سازوں کی خدمت میں	ادارہ	4
کیا نفسِ انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہے؟	پرویزؒ	8
کشمیر اور برما کے مسلمانوں کی مدد کرنا	خواجہ ازہر عباس، کراچی	21
حاصلِ مطالعۂ لغات القرآن	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	30
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر:4)	محمد علی صابر صدیقی	33
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	40

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 7 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam) Episode No. 1	59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبت مرغِ چمن کب تک!
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

قانون سازوں کی خدمت میں

مملکتیں وجود میں آتی ہیں، مملکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں، سلطنتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ حکومتیں بنتی ہیں، حکومتیں ٹوٹتی ہیں۔ یہ تاریخ کی گردشِ دولابی ہے جو شروع سے آج تک جاری وساری ہے۔ حکومتوں کے نفع بخش کارناموں کی یاد ان کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہتی اور زبان پر آتی ہے۔ ان کے مظالم کا رونا خود ان کی موجودگی میں بھی رویا جاتا ہے۔ ان کے مرتب اور نافذ کردہ قوانین بھی اپنی مدت العمر ختم کرنے کے بعد صفحہء تاریخ سے مٹ جاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے قوانین لے لیتے ہیں۔ اس تبدیلی میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگتا کیونکہ زمانے کے تقاضے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی حکومت جو لکیریں مذہب کے نام سے کھینچ دیتی ہے ان کی عمر بڑی دراز ہوتی ہے اور (اگر وہ غلط تھیں تو) ان کی تباہ کاریوں کا سلسلہ بھی مدتِ مدید تک جاری رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ مذہب کا تعلق انسان کے لطیف ترین جذبات سے ہوتا ہے اور ان کے پیدا کردہ نقوش مٹتے مٹتے بھی صدیاں لے لیتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے اس سلسلۂ محو وثبات کے لئے ایک نئی طرح ڈالی۔ اس نے کچھ اقدار متعین کیں اور کچھ اصول عطا فرمائے ان کے متعلق کہہ دیا کہ لا تبدیل لکلمٰتہ۔ یہ کبھی تبدیل نہیں ہوسکیں گے۔ لا تبدیل لکلمٰتہ۔ حکومتیں آئیں اور جائیں۔ ان کے آئین ودساتیر بدلتے رہیں۔ لیکن ان ابدی اصول واقدار کو کوئی حکومت بدل نہیں سکے گی۔ ان کا نام اسلام ہے اور ان کے مطابق قائم کردہ نظام کا نام الدینؔ۔ الدینؔ کے یہ اصول واقدار غیر متبدل رہیں گے، ان کے نفاذ کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ جس حکومت کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا، وہ اسلامی حکومت کہلائے گی۔ اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہوگی، تو قرآنی اقدار واصول، قرآن کے صفحات میں محفوظ رہیں گے اور ان کے نفاذ کے لئے جو طرق واسالیب (سابقہ) اسلامی

حکومت نے وضع اور نافذ کئے تھے ان کی اسلامی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ان کی حیثیت' مذہبی رسوم و مناسک کی رہ جائے گی۔ ان رسوم و مناسک کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لینا انہیں کتاب اللہ کے ہم پلہ قرار دینا ہوگا جو شرک ہے۔

اسلامی حکومت' حضور نبی اکرم ﷺ کے عہدِ ہمایوں میں قائم ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تک باقی رہی۔ اس حکومت میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی۔ کتاب اللہ کے احکام و اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لئے جو طور طریق اختیار کئے گئے تھے (جنہیں آپ جزئی قوانین شریعت کہہ لیجئے) انہیں نہ غیر متبدل قرار دیا گیا تھا نہ انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا۔ یہ وجہ تھی کہ اس دور میں کتاب اللہ کی حفاظت کا تو اس قدر اہتمام کیا گیا لیکن ان جزئی قوانین کو نہ کہیں مرتب و مدون کیا گیا' نہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا گیا۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے تحت بدلتے رہنا تھا اس لئے انہیں منضبط کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔۔۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث رسول اللہ ﷺ یا عہدِ خلافت راشدہ میں جاری کردہ احکام کا کوئی مجموعہ اس زمانے میں ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا' تو اس کی وجہ ہی یہ تھی۔ جس چیز کو غیر متبدل رہنا تھا (یعنی کتاب اللہ) اس کی نشر و اشاعت اور نظم و ضبط کا انہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ (امام ابنِ حزمؒ کے قول کے مطابق) عہدِ فاروقیؓ میں مملکت میں قرآنِ مجید کے قریب ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے لیکن اس دور کے بدلتے رہنے والے انتظامی احکام کی ایک چٹ بھی کہیں نہیں ملتی۔

اس کے بعد بنو امیہ کا دور آیا۔ اس دورِ حکومت کا جو نہایت بھیانک نقشہ تاریخ میں کھینچا گیا ہے' ہم سرِ دست اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم اس کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ انہوں نے بھی اپنے احکامِ حکومت کا کوئی ضابطہ مرتب مدوّن نہیں کیا اور جب مرتب ہی نہیں کیا تو اس کی حفاظت کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ اس دور میں نہ کسی خاص فقہی مذہب کا نشان دیکھیں گے' نہ فقہی قوانین کے کسی مجموعہ کا تذکرہ۔ انہوں نے بھی قرآن ہی کی حفاظت کی اور اسی کو آگے پہنچایا۔ یہ وجہ ہے جو اس دور میں نہ امت میں فرقے پیدا ہوئے' نہ فرقہ وارانہ فقہیں وجود میں آئیں۔

اس کے بعد عباسی دور ہمارے سامنے آتا ہے جو سابقہ ادوار سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ ان کی حکومت بھی اسلامی نہیں تھی کیونکہ ملوکیت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں جو یک جا ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن اس دور میں مختلف فقہیں مرتب و مدوّن ہوئیں۔ ان کی وجہ سے امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ توحید نام تھا ایک کتاب اللہ کی حکمرانی کا۔ جب اس کی حکمرانی نہ رہی تو امت میں توحید بھی باقی نہ رہی۔۔۔ توحید تو ایک طرف' امت کی وحدت بھی باقی نہ رہی۔ وہ حنفی' شافعی' حنبلی' مالکی وغیرہ گروہوں میں بٹ گئی۔ یہی وہ فرقہ بندی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا تھا۔ جوں جوں یہ دور آگے بڑھتا گیا' امت کا انتشار' خلفشار' افتراق' اختلاف بھی زیادہ ہوتا گیا۔ اب امت کا کوئی فرد' صرف مسلم کے نام سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اسے بتانا

پڑتا تھا کہ کونسا مسلمان۔۔۔شیعہ، سنی، اہلِ حدیث، اہلِ فقہ، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی (اور نہ جانے کتنی اور اضافی نسبتیں)۔

عباسی دورِ حکومت ختم ہو گیا لیکن اس دور میں پیدا شدہ مختلف فقہیں اور ان کی نسبت سے مختلف فرقے آگے چلتے گئے۔ اب انہی فقہوں کا نام اسلام ہے اور ان کے پیروؤں کا نام مسلمان۔ اور نظامِ حکومت، ملوکیت۔ یعنی مسلمانوں کی زندگی، اصول اور فروع، دونوں اعتبار سے خلافِ اسلام! یہ فقہی احکام چونکہ زمانے کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، اس لئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق یہ آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے تھے۔ اس کی جگہ مسلمان مملکتوں نے اپنے یہاں سیکولر نظام رائج کر لیا۔ یعنی قرآن کی طرف وہ پھر بھی نہیں آئیں۔ قرآن کی طرف وہ آ بھی نہیں سکتی تھیں۔ قرآن تو ہر قسم کی شخصی حکومت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

مدت سے مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی کی یہی صورت ہے۔۔۔یعنی نظامِ حکومت یا ملوکیت یا سیکولر ہے، اور اس میں شخصی قوانین کی حد تک کسی نہ کسی فقہ کے احکام کارفرما ہیں۔ قرآن کا مصرف، صرف یہ رہ گیا۔

کہ از یٰسین او آساں بمیری

(یعنی قرآنِ کریم کی سورہ یٰسین کا فائدہ یہ ہے کہ اس کو پڑھنے سے مسلمان کی جان آسانی سے نکل جاتی ہے)

اس صورتِ احوال کی شدتِ احساس کا نتیجہ تھا کہ علامہ اقبالؒ نے ایک ایسی جدید مملکت کا تصور دیا جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو اور اس طرح اسلام اپنی حقیقی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے آ سکے۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ دونوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس مملکت میں قرآنی قوانین نافذ ہوں گے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب یہاں قانون سازی کا وقت آیا تو نہ علامہ اقبالؒ موجود تھے نہ قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ۔

ہم مملکت پاکستان کے قانون سازوں اور قانون دانوں کی خدمت میں قیام پاکستان کے تہتر ویں برس میں ایک بار پھر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں **آئینِ پاکستان کو صرف اور صرف قرآن کے تابع کر لیں اور اس سلسلے میں ایک ترمیمی بل پیش کریں۔** ہماری ان گذارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم بارگاہِ خداوندی میں بری الذمہ ہو سکیں کہ: **اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ** (7:62) **ہم نے پیغاماتِ خداوندی آپ حضرات تک پہنچا دیئے تھے اور آپ بارگہٗ خداوندی میں یہ عذر پیش نہ کر سکیں۔ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ** (7:172) **ہمیں ان باتوں کا علم نہیں تھا۔** ہمیں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔ **فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ** (40:44) اگر آپ آج اسے قابلِ غور نہیں سمجھتے تو ایک وقت آئے گا جب آپ ان باتوں کو یاد کریں گے۔ باقی رہے ہم سو اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد ہم اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ **اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ** (40:44)

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربٰو (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہوذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

پروفیسر

کیا نفسِ انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہے؟

9 مارچ 1984ء کو سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ پر دیئے گئے ایک درسِ قرآن سے ماخوذ

نفسِ انسانی پر تحقیق:

عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ شہادت میں نفسِ لوامہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ قرآن میں یہ جو نفس ہے یہ شروع سے آخر تک چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے اس لفظ کے بہت مختلف اور متعدد معنی ہیں، لیکن جب یہ چیز انسان کے ضمن میں آئے گی تو یہ ایک عجیب چیز ہے کہ جس کے متعلق بتایا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ ہے کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ مغرب کے علم النفس کے ہاں یہ ایک الگ علم ہی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انہوں نے بڑی تحقیق کی اور سائیکالوجی کے انداز سے کیے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاں Soul [1] (روح) کا اور سائیکی Psyche کا قصہ چلا آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی یہ کہا ہے کہ کسی زمانے میں، یونان کی فکر میں، اسے Soul یعنی روح کہا، عیسائیت میں آ کر اسے Spirit [2] کہا۔ اس کے بعد، علم کی دنیا میں آئے، تو اِسے Mind کہا۔ Mind سے بھی آگے بڑھے، اس سے کام نہیں چلا، پھر اسے (Psyche) سائیکی کہا۔ یہ ان کے ہاں کی چیز آ گئی۔ اس پر تحقیق ہو رہی ہے یعنی یہ بات یہ ہے کہ ایک تو انسان کا جسم ہے، جسے Physical Body (طبعی جسم) کہتے ہیں۔ یہ فزیکل باڈی (طبعی جسم) حیوانی سطح کی چیز ہے، اس کے تقاضے وہی ہیں جو ہر حیوان کے تقاضے ہیں: کھانا، پینا، زندہ رہنا، اولاد پیدا کرنا، ایک وقت کے بعد پھر اس مشینری کا بند ہو جانا، مر جانا۔ اس میں کوئی بھی خصوصیت انسان کی نہیں ہے، یہ اسی سطح کی چیز ہے لیکن اس میں ایک چیز ایسی ہے جو اس سے پہلے کی ارتقائی سطح میں جو Life یا زندگی رہی ہے، یعنی حیوانات کی سطح تک بھی لیجیے، وہاں یہ نہیں ہے اور وہ ہے اختیار اور ارادہ۔

انسان کے لیے اختیار و ارادہ کی صلاحیت اور توانائی:

اب یہاں دو Possibilities (ممکنات) سامنے آئی ہیں: دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا اور دوسرا چھوڑ دینا۔ یہ ایک چیز ہے۔ حیوانات تک میں جبلت (Instinct) ہے، وہ ایک ہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کے ہاں Choice (اختیار) نہیں ہے۔ یہ بکری کے اختیار میں نہیں ہے کہ کبھی جی میں آئے تو گھاس چرلے، کبھی جی میں آئے تو گوشت کھالے۔ بکری بیچاری تو بکری ہوتی ہے، یہ تو شیر کے اختیار میں بھی نہیں ہے کہ اگر کبھی بھوکا مر رہا ہو تو گوشت چھوڑ

---

[1] William Mc Dougall نے بھی زندگی کے اس واسطے کو Soul (روح) کہہ کر پکارا۔

[2] یاد رہے کہ مغرب میں Matter (مادہ) کے مقابلہ میں Spirit کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جس سے مقصود غیر مادی (Immaterial) اشیاء ہوتی ہیں۔

کرانگور کھانے شروع کر دے۔ اب یہاں یہ چیز آئی ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار بنایا' اسے کام کے لیے ارادہ دیا یعنی پہلے تو یہ ایک چیز کی کہ اسے Choice (اختیار) دیا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ کونسا راستہ ہے۔ اس پہ چلنے کا ارادہ کیا جائے یہ خداوندی صفت ہے۔

روح کا مفہوم:

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ انسان کو خدا کی ''روح'' میں سے ایک شمہ [1] دیا گیا۔ ''روح'' کے معنی توانائی ہوتا ہے۔ اصل توانائی تو یہ ہے کہ آپ خود اپنے ارادے سے ایک چیز کو اختیار کریں۔ یہ بہت بڑی قوت ہے۔ یہاں مجبوری نہیں ہے۔ یہ جو خدائی صفت کا ایک شمہ انسان کو دیا گیا تھا' یہ اس کا اختیار و ارادہ ہے۔ قرآن نے اس کو ''نفس'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس کے طبعی جسم کی پیداوار نہیں ہے' نہ ہی یہ طبعی جسم سے متعلق جو قوانین ہیں' مثلاً کھانے پینے کے' مریض ہو جانے کے' شفاء پا لینے کے'' اس سے کوئی تعلق ہے۔ یہ طبعی جسم صرف فزیکل یا طبعی چیز ہے۔ اس کا تعلق ان سے بھی نہیں ہے' یہ ان قوانین سے بھی ماوراء ہے۔ یہ فیصلہ کرتا ہے' ارادہ کرتا ہے' انسان کے طبعی جسم کو عمل کے لیے آمادہ کرتا ہے' تقویت پہنچاتا ہے' اور اپنے فیصلے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ جو انسان کا کوئی کام یا کوئی عمل ہے' اس کی ذمہ داری جس پہ آتی ہے یہ وہ ہے' جسے نفس کہا گیا ہے: فیصلہ کرنے والا' ارادہ کرنے والا۔ پھر یہ وہ ہے جس پر انسان کے عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' یہی ہے' وہ جسے قرآن نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انگریزی زبان میں بھی اس کے لیے یکے بعد دیگرے اتنے الفاظ' اتنی اصطلاحات' اختیار کی گئیں اور پھر Discard (رد) بھی کر دی گئیں' مگر ابھی تک بات نہیں بنی۔

وہ ''میں'' کیا ہے:

عزیزانِ من! قرآن اسے ''نفس'' کہہ کر پکارتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا ہے؟ اسے تو آپ چھوڑ دیجیے۔ یہ سوچیے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ میں نے یہ کیا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ ''میں'' [2] کیا ہے جس نے یہ کیا ہے۔ علمی بحث کو چھوڑ دیجیے۔ اصل یہ ہے کہ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہوا ہے' ورنہ اگر ہم سوچتے تو اس علمی بحث میں جانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یہ کیا بات ہے! جو ہم کہتے ہیں کہ یہ ''میں'' نے کیا ہے۔ ''میں'' اس کا ذمہ دار ہوں۔ اس ''میں'' سے مراد کیا ہے؟ اگر آپ کے

---

[1] ایک مرحلہ تک طریقِ تخلیق' حیوانات اور انسانوں میں مشترک چلا آتا ہے۔ اس کے بعد' انسان کی صورت میں' ایک انقلابی تبدیلی (Emergent Evolution) واقع ہوتی ہے' جس میں اس کا تخلیقی سلسلہ حیوانات سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا' انسان کو اپنی الوہیاتی توانائی (Divine Energy) کا ایک شمہ عطا کر دیتا ہے۔ اسے انسانی ذات (Human Personality) کہا جاتا ہے' جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہوتی ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: (32:9)۔ [2] پروفیسر اروِن شروڈنجر (Erwin Schrodinger :1887-1961) نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے لیکن بڑی اہم ہے۔ اس کا نام ہے: What is Life؟ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں' وہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ وہ اس کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے: ''میں'' کسے کہتے ہیں؟ اگر آپ ''میں'' کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ ''میں'' Porsonality Imness, Self کہتے ہیں۔ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے..... اگر کوئی ماہر عمل تنویم (Hypnotist) ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے پھر تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری ''میں'' کی موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ لہٰذا انسانی ذات (Human Self) کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

ہاتھ نے چوری کر کے کوئی چیز جیب میں ڈال دی ہے تو یہ ہاتھ تو وہ ''میں'' نہیں ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ یہ میرے ہاتھ نے کیا ہے' میں نے نہیں کیا۔ یہ ''میں'' کیا ہے؟ آپ اس علمی مخمصے میں جایئے ہی نہیں۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ ''میں'' نے کیا ہے بس وہی تو نفس ہے۔ وہ انسان کا طبعی پیکر نہیں ہے' ہاتھ نہیں' پاؤں نہیں' آنکھ نہیں' کان نہیں۔ وہ یہ چیزیں نہیں ہیں لیکن یہ ان سے الگ بھی نہیں ہیں' اس نے چوری کرنے کا فیصلہ کیا ہے' اس کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا ہے' ہاتھ نے پکڑا ہے' ہاتھ نے چوری کی ہے' ہاتھ جیب میں ڈلا ہے' پاؤں سے بھاگا ہے۔ وہاں سے لے کر یہ ساری چیزیں تو ٹھیک ہیں۔ یہ ایک مشینری ہے' ذرائع ہیں' اس نفس کے فیصلے کے بروئے کار لانے کے۔ تو ذمہ داری تو اس پہ عائد ہوتی ہے جس نے وہ فیصلہ کیا ہے یا وہ ان سے سارا کچھ کرا رہا ہے۔ اسی لیے قرآن اسے ذمہ دار قرار دیتا ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ جسم کی موت کے ساتھ وہ مرتا نہیں ہے۔ وہ اپنی ان تمام ذمہ داریوں کی گٹھڑی لیے ان کے نتائج بھگتنے کے لیے آگے چلا جاتا ہے: اگر یہ اعمال اچھے ہیں تو ان کی آسائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے' اور اگر برے ہیں تو ان کے اثرات بھگتنے کے لیے۔ یہ مرتا نہیں ہے۔ یہ اس کی خصوصیت ہے۔ حیوانی سطح زندگی تک حیوان کا جسم مرتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان میں پہنچ کر اس کا جسم مرتا ہے' اس کا ''میں'' نہیں مرتا۔ یہ ''میں'' اپنی ذمہ داریوں کو لیے ہوئے آگے چلا جاتا ہے۔

انسانی نفس کی مختلف اقسام اور خصوصیات:

عزیزانِ من! اب اس نفس پر آ جایئے۔ ہمارے ہاں بھی عام طور پر تین نفس گنے جاتے ہیں: نفسِ امارہ [1] نفسِ لوامہ [2] اور نفسِ مطمئنہ [3]۔ قرآن میں ان تینوں کا ذکر ہے لیکن ہمارے ہاں کی اصطلاح اور قرآن کی اصطلاح میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہے جیسا کہ یہ تین الگ الگ نفس ہیں: نفسِ امارہ انسان کو برائی کے لیے آمادہ کرتا ہے' نفسِ لوامہ انسان کو اُس بات پر ٹوکتا ہے' ملامت کرتا ہے جو اس نے برا کام کیا ہے اور نفسِ مطمئنہ وہ ہے' جو اس اضطراب سے' اس کشمکش سے' آگے چلا جاتا ہے' وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے۔ گویا ہمارے ہاں کچھ تصور ایسا ہے جیسا انسان کے اندر الگ الگ یہ تین نفس ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تینوں اسی ایک ہی نفسِ انسانی کی الگ الگ خصوصیات ہیں' الگ الگ Aspects (گوشے) ہیں' الگ الگ Chracteristics (خصوصیات) ہیں' الگ الگ Functions (افعال) ہیں۔ یہ تمام اسی ایک ہی نفس کی مختلف خصوصیات ہیں۔ وہی نفس ہے جو یہ سب کچھ کرتا ہے۔

نفسِ امارہ کیا ہے؟:

عزیزانِ من! سمجھنے کی بات ہے۔ پہلے تو یہ عرض کر دوں کہ نفسِ امارہ کا ذکر سورۃ یوسف میں آیا ہے۔ وہ قول' ویسے تو عزیز کی بیوی سے منسوب ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ [4] (12:53)۔ عزیز کی بیوی نے جب اپنی لغزش کا' اپنے جرم کا' اپنے گناہ کا' اعتراف کیا تھا' تو اس نے یہ کہا تھا کہ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ (12:53) میں

---

[1] نفس الامارہ صرف 12:53 میں آیا ہے۔ [2] نفس اللوامۃ صرف 75:2 میں آیا ہے۔ [3] نفس المطمئنۃ صرف 89:27 میں آیا ہے۔ [4] حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اسے برائی کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں قرار دیتی۔ اصل یہ ہے کہ قرآن نے اس کے یہ الفاظ کوٹ (نقل: Quote) کیے ہیں کہ یہ جو نفس ہے، یہ برائی کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے، اکساتا رہتا ہے، حکم دیتا رہتا ہے۔ یہ ہے امارہ، جہاں یہ لفظ آیا ہے۔ یہیں قرآن نے ایک بات بڑھائی ہے۔ خواہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے، اپنی طرف سے یہ بات کہی ہے یا یہ اسی عزیز کی بیوی کا قول نقل ہے لیکن کہا یہ ہے کہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ❶ (12:53)۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بنیادی طور پر وہ نفس یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ انسان کو برائی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ یہاں قرآن نے عیسائیت کے ایک عقیدے کو کاٹ کے رکھ دیا۔ عیسائیت میں یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا کہ یہ جو انسان کا نفس ہے وہ برائی کی طرف بھی لے جاتا ہے لیکن جس پہ خدا کی رحمت ہو، خدا کا رحم ہو، وہ یہ نہیں کرتا۔ تو بنیادی طور پر یہ نفس کی چیز نہیں ہوئی کہ وہ برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ برائی کی طرف وہ نفس لے جاتا ہے جو رحمِ خداوندی میں نہیں ہوتا۔ وہ میں الگ عرض کرونگا کہ یہ کیا چیز ہوگئی۔ قرآن تو، عزیزانِ من! دو دو لفظوں میں اس قدر بنیادی حقائق بیان کر جاتا ہے۔ یہ عیسائیت کا اتنا بڑا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے بھی، خواہ یہ اسی عزیز کی بیوی کا قول نقل تھا، کہا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (12:53)۔ امارہ کے معنی ہیں ''بڑی شدت سے امر کرنے (اکسانے) والا''۔ لیکن اس کے بعد قرآن نے فوراً یہ کہہ دیا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نفس کرتا ہی یہ ہے، وہ ہوتا ہی اس کام کے لیے ہے، وہ گناہ کے لیے ہی آمادہ کرتا ہے، وہ ہمیشہ جرم کی طرف آمادہ کرتا ہے بلکہ یہ کہا کہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ (12:53) اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔

عزیزانِ من! درمیان میں آپ ادھر نفس مطمئنہ کی طرف چلے جایئے، لوامہ کی طرف میں بعد میں آونگا۔

نفس مطمئنہ کیا ہے؟:

نفس کی تیسری اسٹیج مطمئنہ ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاحات ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے بنیادی معنی کی طرف جایئے تو انسان جھوم جاتا ہے۔ یہ ہے وہ نفس قرآن جو انسان کو جنت میں جانے کے لیے کوالیفائیڈ کر دیتا ہے کہ ہاں یہ ہے اصل مستحق۔ جسے جنت میں جانا ہے، اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝۲۷ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝۲۸ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝۲۹ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝۳۰ ❷ (89:27-30)۔ یہ ہے نفسِ مطمئنہ کی Balanced Mind (متوازن نفس) کی، وہ اسٹیج جس میں کوئی اضطراب نہیں، ریب نہیں، کشمکش نہیں۔ اطمینان سے یکسو ہو گیا ہے، صحیح فیصلے کیے ہیں،

---

❶ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز) ❷ وہ شخص جس نے قانونِ خداوندی کے اتباع سے، سکونِ گہر کی طرح، دل کا صحیح اطمینان حاصل کر لیا ہو (13:28) یعنی جس کی ذات میں، صحیح نشوونما سے، پورا پورا توازن پیدا ہو چکا ہوگا (91:9) اُس سے کہا جائے گا کہ تیرا طریقِ زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا، اس لیے تیری زندگی پسندیدہ خوش گواریوں کی حامل ہوگی۔ تجھے تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے حسبِ منشا آسائشیں حاصل ہوں گی۔ (لیکن اے رسولؐ! انہیں متنبہ کر دو کہ یہ چیز انفرادی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی، اجتماعی زندگی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ) تم ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے خدا کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے یعنی جماعت مومنین میں۔ اور اس طرح اس جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہے (9:119)۔ (اس دنیا میں بھی جنتی زندگی اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔) (ایضاً)

صحیح مقام حاصل کیا ہے اور یہی وہ مقام ہے کہ جس کو وہ کہتا ہے کہ جنت میں جانے کا اہل ہو گیا' قرآنِ کریم نے اسے اس کے لیے کوالیفائیڈ کر دیا' وہ جس کے قابل ہو گیا۔

جنت ہو یا جہنم' اس میں اجتماعی طور پر ہی جانا ہوتا ہے:

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قرآن ہے' یہ کہیں بھی' کوئی بھی بات بیان کرے' وہ جو اس کا اپنا اصل مقصد ہے' اسے بیچ میں' ساتھ لے آتا ہے۔ یہ یہاں بھی لے آیا کہ یہ جنت یا جہنم میں جانا انفرادی چیز نہیں ہے' اجتماعی ہے۔ جسے آپ نجات کہتے ہیں وہ ہر فرد کی الگ الگ نہیں ہوتی۔ یہ روحانیت نہیں ہے کہ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشتی۔ جب تک خود نہ پیو' پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ یہ کیا ہے۔ یہ خانقاہیت نہیں ہے' یہ عیسائیت نہیں ہے' یہ Mysticism (باطنیت) نہیں ہے' یہ تو جنت میں جانا ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿89:29﴾ (دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر جانا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! کہ قرآن کا کوئی مقام بھی آتا ہے جو اس کی اصل تعلیم ہے وہ اس کو ضرور فوکس (Focus) کر کے سامنے لاتا ہے۔ یہاں کہا کہ نفسِ مطمئنہ تو انفرادی ہے' ہر فرد کا اپنا اپنا ہے۔ ساری دنیا کے مذاہب یہی کہتے ہیں کہ اگر ہر فرد اپنے آپ میں پاکیزگی اختیار کر لے تو وہ نجات (Salvation) کے قابل ہو جائے' ترقی کے قابل ہو جائے' مکتی کے قابل ہو جائے۔ اگر ایسا کر لے تو اس فرد کی مکتی ہو جاتی ہے۔ فرد کا تزکیہ' پاکیزگی' سیرت کی بلندی' قرآن کا بھی مقصود ہے۔ وہ یہ کچھ کرنے کے لیے نفس کو کہتا ہے لیکن یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ اس سے نجات نہیں ہوتی۔ یہ ایک ہیئت اجتماعیہ چاہتا ہے۔ ایک فرد تنہا جنت میں نہیں جاتا ہے' جماعت کے ساتھ جاتا ہے' جہنم میں بھی جماعت کے ہی ساتھ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ قرآن میں ہے۔ آجکل جس جہنم کے اندر دنیا ہے اور بالخصوص ہم ہیں وہ تو آپ کو یاد ہے۔ ہمارے ہاں کا ایک ایک فرد جنت میں نہیں ہے بلکہ پوری کی پوری قوم جہنم کے اندر ہے۔ اور اگر کوئی یہ چاہے کہ جہنم میں کوئی ایک فرد' جنتی ہو جائے تو وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو پوری جماعت کو ہونا ہوگا: یا جنتی ہونا ہوگا یا جہنمی ہونا ہوگا۔ میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ قرآن کوئی بات بھی کہے' کوئی حقیقت بھی بیان کرے' وہ جو اصل مقصود ہے' وہ اسے ضرور ساتھ لے آتا ہے۔ یہاں کہا کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿89:29﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿89:30﴾ [1]۔ جنت میں جانے کا یہ طریقہ ہے اور یہ ہے نفسِ مطمئنہ۔

نفسِ لوامہ اور انسانی ضمیر کی تشریح:

اب آیئے نفسِ لوامہ کی بات کی طرف۔ اس کے معنی ہیں: ملامت کرنے والا۔ ہمارے ہاں ایک عام چیز ہے اسے ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اپنے ضمیر سے پوچھو۔ ضمیر کی آواز کا شہرہ ہے اور کہتے ہیں کہ ضمیر کی آواز پر چلنا چاہیئے' گویا ضمیر کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیشہ صحیح بات کہتی ہے' جائز کہتی ہے' سچی بات کہتی ہے' حقیقت کی بات کہتی ہے۔ یعنی

---

[1] تم ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے خدا کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے' یعنی جماعت مومنین میں تو اس طرح اس جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہے (9:119)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

انسان کے اندر کوئی ایسی چیز رکھی ہوئی ہے جو غلط اور صحیح، حق اور باطل میں امتیاز کر دیتی ہے اور پھر انسان کو یہ بتا دیتی ہے کہ حقیقت کی بات کیا تھی۔ عزیزانِ من! انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ حق اور باطل کی تمیز کر سکے۔ اگر یہ چیز انسان کے اندر ہوتی تو کسی فرد کو وحی کی ضرورت ہی نہ پڑتی، رسول کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ہوتا یہ کہ انسان کے اندر یہ چیز موجود ہے، خود فیصلہ کر لے۔ حیوانات کی زندگی میں یہ بات ان کے اندر ہے۔ اس چیز کی میں مثال دیا کرتا ہوں کہ مرغی کے نیچے آپ کچھ بطخ کے اور کچھ مرغی کے انڈے رکھ دیجیے، کچھ وقت کے بعد جب ان سے چوزے نکلیں گے تو مرغی کے چوزے تو خشکی کی طرف بھاگیں اور بطخ کے چوزے پھڑک کر پانی کی طرف چلے جائیں گے۔ ان دونوں کو کس نے بتایا ہے؟ یہ غلط اور صحیح کی تمیز، یہ حق اور باطل کا امتیاز انہیں کس نے بتایا ہے؟ کوئی رسول تو ان کی طرف نہیں آیا۔ یہ چیز ان کے اندر رکھی ہوئی ہے، جسے جبلت کہتے ہیں، Instinct کہتے ہیں۔ یہ ہے ان کے اندر رکھی ہوئی بات۔ اس قسم کی کوئی چیز انسانی بچے کے اندر نہیں رکھی ہوئی۔ اس کو دیکھیے، بچہ ذرا گھٹنوں چلنے لگے، ماں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے: وہ چولہے میں ہاتھ ڈال دیا، وہ مرچیں کھا گیا، آنکھوں میں لگا لیں، چیں چیں کر رہا ہے، پھر اس کے بعد ادھر سے اترا تو پانی میں ڈبکیاں لے رہا ہے۔ حیوان کا کوئی بچہ ایسے نہیں کرتا۔ مرغی کا چوزہ کبھی پانی کی طرف نہیں جاتا ہے۔ یہ یہی حضرت اشرف المخلوقات ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر دیکھیں گے، کیا کریں گے۔ اسی لیے رہنمائی کے لیے اسے خارج سے ضرورت پڑی ہے: وحی کے ذریعے، انبیائے کرام کے ذریعے، یہ بتانے کی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔

ایک چیز تو اضافی ہوتی ہے جیسے اچھی اور بری، غلط اور صحیح کہتے ہیں۔ اسے Relative (اضافی) کہتے ہیں اور دوسری چیز وہ ہوتی ہے جسے کہتے ہیں کہ وہ فی الواقعہ ایک چیز ہے، فی الواقعہ وہ ایسی ہوتی ہے۔ اسے مطلق کہتے ہیں، اسے Absolute کہتے ہیں۔ جیسے خیر اور شر، جیسے غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز یعنی یہ کہ ایک چیز فی الواقعہ ناجائز ہے، غلط ہے، باطل ہے۔ دوسری یہ چیز ہے کہ موقعہ محل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک وہ اچھی ہے۔ آپ نے جس گاؤں میں جانا ہے، اُس کے لیے آپ نے چوراہے سے وہ راستہ اختیار کیا جو گاؤں لے جائے تو وہ صحیح راستہ ہے لیکن یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ جس گاؤں کی طرف آپ نے جانا ہے یہ اس طرف جاتا ہے۔ اگر آپ دوسرے راستے پہ چل پڑے جو اس طرف نہیں جا رہا تو یہ راستہ غلط ہے۔ وہ راستے تو دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی صحیح راستہ ہے، نہ کوئی غلط راستہ ہے۔ آپ نے خود جس طرف جانا ہے اس کے لحاظ سے وہ صحیح اور غلط ہو جاتا ہے۔ اسے اضافی (Relative) کہتے ہیں تو دوسرا راستہ جو آپ کو مطلوبہ گاؤں تک لے جائے وہی آپ کے لیے صحیح ہوگا۔

مطلق خیر اور مطلق شر کا علم وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے:

عزیزانِ من! عام درس سے باتیں یوں کچھ اِدھر اُدھر ہٹ جاتی ہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ بات اسی سطح پر رکھوں کہ بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی تاکہ ہر ایک کی سمجھ میں بات آ جائے۔ انہیں کہتے ہیں اضافی یا Relative، اچھا یا

برا ہونا۔ یہ فیصلہ انسان خود کر سکتا ہے۔ اپنے لیے خود ہی اس نے فیصلہ کیا کہ میں نے شہر کی طرف جانا ہے' یہ سڑک سیدھی جا رہی ہے۔ یہ سیدھی اس کے لیے صراطِ مستقیم بن جائے گی۔ اگر اس نے فیصلہ کیا کہ ماڈل ٹاؤن کی طرف جانا ہے تو یہ گمراہی ہو جائے گی۔ لیکن ایک چیز یہ ہے کہ وہ فی الواقعہ گمراہی ہے یا وہ فی الواقعہ صراطِ مستقیم ہے۔ یہ Relative (اضافی) نہیں ہے' یہ مطلق ہے۔ یہ چیز کہ اپنی حلال کمائی سے رزق حاصل کرنا ہے' یہ ہے صحیح' دوسرے کی محنت کو Exploit (سلب) کرنا ہے' یہ ہے باطل اور یہ ہمیشہ ہے' ہر حال میں ہے' ہر شخص کے لیے ہے' یہ بدل نہیں سکتی' یہ Relative (اضافی) نہیں ہو سکتی۔ آپ اپنے دوست کی عزت کرتے ہیں' کل ہی کو وہ دوست دشمن ہو جاتا ہے۔ پھر آپ اس کی عزت نہیں کرتے۔ یہ جو آپ نے عزت کی ہے' یہ Relative (اضافی) ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ ہر انسان واجب التکریم ہے۔ یہ مطلق ہے۔ اس میں اب یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ یہ دشمن ہو گیا' یا یہ دوست ہو گیا' یا یہ اپنا ہے' یا بیگانہ ہے' یہ میری قوم کا ہے' یہ دوسری قوم کا ہے۔ یہ ایک حقِ مطلق ہے۔ یہ جو مطلق خیر یا مطلق شر ہے اس کا علم انسان کے اندر نہیں ہے۔ یہ صرف وحی کے ذریعے اس کو' رسولوں کی معرفت' ملا ہے۔ چونکہ وحی اور رسالت ہندوؤں کے ہاں نہیں تھی یا کبھی آئی تھی مگر ان کے ہاں گم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا یہ دھرم بنا لیا کہ پیدائشی اعتبار سے ایک شودر پیدا ہوتا ہے' ایک برہمن پیدا ہوتا ہے' برہمن بچے کی ساری عمر عزت کی جائے گی' شودر کو جوتی کے تلے رکھا جائے گا۔ ان کے ہاں کا یہ دھرم ہو گیا۔ یہ باطل ہے۔ حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچے کی پیدائش کے اعتبار سے کوئی نسبت نہیں ہے' کوئی اضافی بات نہیں ہے' اس کا انسان ہونا اُسے واجب التکریم بنا دیتا ہے' تکریم اس کا حق ہے۔

ضمیر کی آواز کیا ہے؟:

عزیزانِ من! اب آیئے اس طرف جسے آپ ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔ مسلمان کا بچہ گائے کا گوشت لذت لے لے کر کھا جاتا ہے' ہندو کے سامنے رکھیے' اسے قے آ جاتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہ ان دونوں کے ضمیر کی آواز ہے؟ کسی نے ان ہندوؤں سے یہ نہیں کہا کہ اس سے بچو' یہ گائے کا گوشت ہے اور اس مسلمان کے بچے سے یہ نہیں کہا: ''کھا جاؤ''۔ کیا یہ اس کے اندر کی آواز ہے؟ کیا ہے یہ آواز؟ اس ہندو کے بچے نے' جس سوسائٹی میں' جس ماحول میں' جس معاشرے میں' پرورش پائی ہے' جو اس کے کان میں بچپن سے آواز آتی چلی گئی ہے' جو کچھ وہاں آہستہ آہستہ بتایا گیا ہے' یہ چیز اس کے تحت الشعور میں آ گئی: جو گائے کا گوشت ہے وہ ہم نے نہیں کھانا۔ یہ آواز اس کے کان میں پڑی۔ مسلمان بچے کے کان میں ہی نہیں پڑی' بلکہ گائے کا یہ گوشت گھر میں پکنا شروع ہوا ہے' اس نے اپنے ماحول کا یہ اثر لیا ہے' اُس نے اپنے ماحول کا وہ اثر لیا ہے' تو ضمیر تو اسی کا نام ہے۔ حقِ مطلق یا خیرِ مطلق یا شرِ مطلق کے لیے یہ فیصلہ کن چیز نہیں ہے۔ یہ تو جس ماحول میں وہ ضمیر پرورش پائے گی' جس ماحول میں پیدا ہو گی' جس ماحول کا اثر لے گی' اس قسم کی اس کی ضمیر بن جائے گی۔ یہ سارے بت پرست ضمیر کی آواز پہ چلتے ہیں۔ ایک انسان کو' یعنی ایک نبی کو' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو' خدا کا بیٹا ماننے والے' ضمیر کی آواز پہ چلتے ہیں۔ آپ اس کی مخالفت کرتے ہیں تو گویا ضمیر کی آواز پہ کرتے ہیں۔ مگر یہ چیز نہیں ہے۔

ضمیر کی آواز حق اور باطل کا فیصلہ نہیں کرسکتی:

عزیزانِ من! جسے انسان کی ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے' وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کا معیار نہیں ہے۔ جس قسم کے معاشرے میں کوئی پرورش پائے گا' اسی قسم کی اس کی ضمیر ہوجائے گی۔ اور جب اس کے خلاف کوئی کام ہوگا' تو اس کی ضمیر اس کے خلاف اِبا کرے گی' اس کے خلاف نفرت کرے گی۔ یہ لوامہ ہوا۔ انسانی نفس کے اندر یہ بات ہے کہ وہ ملامت کرتا ہے۔

نفسِ لوامہ کا عمل:

میں آگے چل کر بتاؤنگا کہ جب آہستہ آہستہ آپ اس ابا کرنے کی پرواہ نہیں کرتے' اسے دباتے چلے جاتے ہیں' جذبات آپ پر غالب آتے چلے جاتے ہیں' پھر وہ ملامت بھی نہیں کرتا۔ وہ جرائم عام ہوجاتے ہیں۔ یہ جتنے جرائم پیشہ ہیں' پھر ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا' بلکہ وہ انہیں قابلِ ملامت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ جن چیزوں کو قابلِ ملامت بھی سمجھتا ہے' وہ وہی ہوتی ہیں جو شروع سے اس کے ذہن میں ڈالی گئی ہیں کہ یہ غلط ہیں۔ اب یہ چیز سمجھ لیجیے کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوامہ ان چیزوں پہ ملامت کرتا ہے جن کے متعلق پہلے سے اس کو بتایا گیا ہے کہ یہ بری ہیں۔ ٹھگوں کا بیٹا اس کی ایک مثال ہے۔ اسے بچپن سے تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم ایک شخص کو مار نہ دو گے اس وقت تک تمہاری شادی نہیں ہوسکتی' اور یہ بھی کہ یہ کالی دیوی کا حکم ہے۔ وہ مارتا ہے۔ وہ ایک شخص تو مارتا تھا۔ پتہ نہیں اب بھی مارتے ہیں یا نہیں۔ اب تو ساری دنیا ٹھگ ہوگئی ہے۔ الگ ٹھگوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جس طرح اقبالؒ (1877-1938) نے ابلیس کی زبان سے لکھا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست دی کہ جی! مجھے اب ریٹائر کرکے چھٹی دیجیے' میں گھر بیٹھوں۔ کہنے لگے: کیوں؟ کہنے لگا: اب تو ہر شخص شیطان ہے' یہاں میری ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ تو اب الگ ٹھگوں کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا' یہ ان کا دھرم تھا۔ ٹھگوں کا بچہ جب یہ جان لیتا تھا' دوسرے کا گلا گھونٹتا تھا تو اس کا ضمیر اس کو ملامت نہیں کرتا تھا۔

ابلیس کی خدا سے چھٹی کی درخواست:

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ اس کا ضمیر اسے کیوں منع نہیں کرتا تھا؟ وہ ضمیر تو وہی تھا جو بچپن سے اس کو سکھایا گیا تھا' سمجھایا گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی ملامت نہیں کرتا تھا۔ تو اسے یاد رکھیے کہ انسانی نفس کے اندر یہ ایک خصوصیت ہے۔ آپ میرے یہ الفاظ سن رکھیے کہ جس چیز کو وہ برا سمجھتا ہے' اس پر وہ ملامت کرتا ہے۔ پھر سنیے! اگر وہ ضمیر زندہ ہے تو جس کو وہ برا سمجھتا ہے' وہ اسے ہی برا کہتا ہے' یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو ضمیر برا کہہ دیتا ہے وہ فی الواقعہ بری ہوتی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے' کہ اس نظامِ سرمایہ داری میں دوسروں کی محنت کو Exploit (غصب) کرنا ہے' جو اس نظام کو صحیح سمجھتے ہیں' انہیں کبھی اس سلب ونہب کی کرک ہی نہیں آتی۔ وہ اسی نظام ہی سے تو زیادہ سے زیادہ نچوڑتے ہیں' ان کا ضمیر اس پہ انہیں ملامت نہیں کرتا۔ تو یہ سن رکھیے کہ ضمیر حق اور باطل کا فی الواقعہ فیصلہ نہیں کرسکتا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے' اس کی تائید کرتا ہے' جسے وہ باطل سمجھتا ہے

وہ اس کی تردید کرتا ہے' اس پر ملامت کرتا ہے' وہ بھی اس وقت تک جب تک وہ زندہ رہتا ہے۔ زندہ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ جرم عام ہو جاتا ہے تو پھر وہ امارہ بن جاتا ہے' اسے برائی کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے' اکساتا رہتا ہے۔ المختصر' لوامہ اس حد تک رہتا ہے جب تک وہ جس چیز کو برا سمجھے اس پہ وہ ٹوکتا رہے۔

نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم:

عزیزانِ من! اب آ گئی۔ نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم۔ اس کے لیے کہا ہے کہ بچپن ہی سے بچے کو یہ تعلیم دو' یہ Environment (ماحول) دو' ایسا معاشرہ دو کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے برا کہا ہے' وہ اسے برا سمجھے' جسے اس نے اچھا کہا ہے' وہ اسے اچھا سمجھے۔ اب اس کی ضمیر کی آواز صحیح آواز ہوگی۔ یہ ہے وہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر شیطان کا گھومتا گھماتا خیال بھی کبھی ان کے سامنے آ جاتا ہے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کے اندر پناہ لے لیتے ہیں۔ ''گھومتا گھماتا خیال'' بھی آ جائے تو یہ اس لیے ہے کہ وہاں تعلیم' تربیت' پرورش ایسی ہوئی ہے کہ جو مطلق حق ہے اسے حق سمجھا ہے' جو مطلق شر ہے' باطل ہے' اسے شر اور باطل سمجھا ہے۔ کسی وقت ایسا ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ خیال نہ رہے' بھول جائے' سہو ہو جائے' نسیان ہو جائے تو کہا کہ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا [1] (28:77)۔ یہ وہ بات ہے مگر وہ ارادۃً یہ نہیں کرتا' جان بوجھ کر یہ نہیں کرتا' اسی کے لیے یہ کہا ہے کہ نسیان سے کبھی ہو سکتا ہے کہ ایک چیز جو باطل تھی' جو غلط تھی' اسے اس وقت غلط نہ سمجھا ہو لیکن جونہی وہ خیال آتا ہے جسے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہتے ہیں' وہ خدا کے قوانین کے پروں کے نیچے پناہ لیتا ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو یہ تعوّذ محض رسم ہی رہ گئی۔ وہ بھی صرف اس وقت جب تلاوتِ قرآنِ کریم کی جائے اور وہ تلاوت بھی رسم ہے' اس سے پہلے یہ کچھ کہنا بھی رسم ہے' ورنہ یہ تعوذ بڑی چیز ہے۔

تعوذ کا مفہوم:

تعوذ جو عوّذ سے ہے' اس کا مادہ (Root) ''ع و ذ'' ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ عرب اُسے کہاں استعمال کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مرغی کے چوزے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں' مرغی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ انہیں چھوڑ بھی دیتی ہے تو وہ اِدھر اُدھر دانہ دنکا چن رہے ہوتے ہیں۔ اگر چیل کا سایہ اوپر آتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آ جاتے ہیں۔ ان بچوں کا اس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آ جانا عوذ کہلاتا ہے۔ اب آپ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کا مطلب و مفہوم سمجھیے۔ اس ''چیل'' کے خطرے سے میں خدا کے قوانین کے پروں کے نیچے پناہ لیتا ہوں' اگر بھول کر بھی کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پھر یہ اعوذ چلتا چلتا کہاں آ گیا۔ یہ تعویذ کا لفظ وہیں سے ہی تو ہے۔

---

[1] اسے نہ بھولو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس' زندگی اس کے بعد بھی ہے۔

(مفہوم القرآن۔ پرویز)

حضرت صاحب کا تعویذ:

عزیزانِ من! اب آپ نے جو خطرات سے پناہ ڈھونڈی تو وہ یہ ہے کہ آپ حضرت صاحب کے اس ایک تعویذ کو گلے میں لٹکا کے چلیے، معاملہ ختم ہو گیا، نہ خدا کے قانون رہے، نہ وہ تعوذ، نہ اعوذ باللہ، نہ پھر وہ شیطان۔

تعویذ کا لفظ ہی عوّذ سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم کہاں پھر رہے ہو، ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ حفاظت کیسے ملے گی۔ حفاظت کے لیے تعویذ ڈالتے ہیں، آپ کے گلے میں ہی نہیں بلکہ اوتے دیوار نال ٹنگ دیندے ہیگے نیں۔ [1] اس سے سارا گھر ہی محفوظ ہو گیا۔ چل بھئی، خدا کا قلعہ بنا دیا، اعوذ باللہ حضرت صاحب کے تعویذ میں آ گیا۔ بڑا خوبصورت شعر ہے:

بہک بہک [2] کے کہاں آ گیا ہے دیوانے مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے دیوانے

بہک بہک [2] کے یہاں آ گیا۔

خدا کے قانون کے پروں کے نیچے آنا:

عزیزانِ من! میں نفسِ لوامہ کی بات کر رہا ہوں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ بچے کی تعلیم، تربیت، پرورش، ماحول، معاشرہ، ایسا کردو جسے اب آج کی اصطلاح میں Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) کہتے ہیں کہ اس کے نفسِ غیر شعوری کے اندر یہ چیزیں آ جائیں کہ یہ حق ہے، یہ باطل ہے، یہ خیر ہے، یہ شر ہے، یہ جائز ہے، یہ ناجائز ہے۔ اگر یہ چیز اس کے اندر موجود ہے تو وہ بالارادہ تو کبھی کرے گا ہی نہیں۔ یہ ہوگی ضمیر کی آواز۔ اگر کہیں بھول چوک سے، سہو و نسیان سے، بے خبری بے خیالی سے، غفلت سے، کوئی قدم غلط اٹھتا ہے تو اٹھنے کے فوراً ہی بعد، قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ خیال گھومتے گھماتے بھی اس کے سامنے آتا ہے، تو فوراً اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے: غلط ہو گیا اور پھر وہ رکتا ہے، پھر وہ خدا کے قانون کے پروں کے نیچے آتا ہے، وہاں پناہ لیتا ہے، وہیں رک جاتا ہے، غلط راستے کے اوپر زیادہ قدم نہیں چلتا، چند قدم کے بعد فوراً واپس آ جاتا ہے۔ یہ فوراً لوٹتا ہے اسے عربی زبان میں توبہ کہتے ہیں اور پھر یہ قرآن ہے، کہتا ہے کہ یہ نفسِ لوامہ تھا جس نے اس کو روک دیا کیونکہ اسکے اندر صحیح تربیت سے، تعلیم سے، خدا کی دی ہوئی یہ چیز رچ بس گئی تھی۔ کسی نے خود فیصلہ کر کے یہ نہیں دی تھی۔ اگر ماں باپ نے ہی فیصلہ کرنا ہوتا، تو ہندو اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں، عیسائی اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں، سب اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں، ہم اپنے بچوں کو وہی تعلیم دے رہے ہیں مگر یہ وہ بات نہیں ہے۔

مطلق خیر اور مطلق شر وہ ہے، جو قرآن کا یا خدا کا بتایا ہوا ہے۔ اسی کی تعلیم و تربیت دی جائے۔ یہ تعلیم و تربیت صرف پڑھانے لکھانے کی ہی بات نہیں ہے، یہ تو جیسے انسان سانس لیتا ہے، اس طرح کی یہ ایک چیز ہے۔ انسان کے اندر یہ خیالات اور معاشرے میں یہ خیالات عام کیے جائیں۔ جب یہ نہ ہو تو صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ صاحب! کیا کیا جائے ''اب رشوت کے بغیر کام ہی نہیں چلتا'' ہر گھر سے یہ آواز آ رہی ہے، بچہ اسے سنے گا، اسے بیوی کہے گی کہ کیا آپ نے یہ جھوٹ بولا،

---

[1] وہ تو اسے دیوار پر بھی لٹکا دیتے ہیں۔ [2] اگلے ہی درس میں (چوبیسواں باب) پرویزؒ نے اس شعر کے پہلے مصرعہ کی خود ہی تصحیح کر دی کہ یہ یوں ہے:

بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے

فریب دیا؟ وہ کہے گا کہ ہو ہی یہ رہا ہے‘ اس کے بغیر بھوکا مرنا ہے۔ بچہ سن رہا ہے۔ اس کا ضمیر مرتب ہو رہا ہے‘ آپ اس کے ضمیر کو بنا رہے ہیں تو جب وہ بڑا ہوتا ہے تو پھر اس سے آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ یہ غلط کو غلط کہے۔ کیسے کہے؟ جسے تم نے صحیح کہا تھا وہ اسے صحیح کہہ رہا ہے۔ تم نے ہر قسم کے فریب کو‘ ہر قسم کی Exploitation (سلب ونہب) کو‘ جائز قرار دیا تھا۔ وہ اسے جائز سمجھ رہا ہے۔ اب اس کا ضمیر تو ملامت نہیں کرے گا۔

ضمیر کے اندر فی الواقعہ کچھ نہیں:

عزیزانِ من! نفسِ لوامہ کی یہ بات‘ میرا خیال ہے‘ آپ نے سمجھ لی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ ایک غلط تصور ہے کہ ضمیر کی آواز انسان کو صحیح بات بتاتی ہے۔ نہیں‘ ضمیر کے اندر فی الواقعہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ضمیر بنائی جاتی ہے۔ اسے معاشرہ بناتا ہے‘ تعلیم بناتی ہے‘ تربیت بناتی ہے‘ ماں باپ بناتے ہیں۔ یہ وعظ ونصیحت سے کم بنتی ہے۔ جو احوال اور کام ہوتے ہیں‘ یہ ان سے بنتی ہے۔ اب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ نفسِ لوامہ کی کتنی اہمیت ہے۔ جہاں ضمیر کا یہ غلط تصور ہو‘ وہ انسان کو کبھی برائی سے نہیں روک سکتا۔ وہ تو امارہ ہی بن جاتی ہے۔ قرآنی تعلیم وتصور کی اگر بنیادوں پر‘ جو خدا نے دی ہیں‘ ضمیر مرتب کی ہوئی ہو‘ تو پھر وہ ضمیر ایسے وقت میں‘ جو سہو ونسیان سے غلط قدم اٹھتا ہے‘ اس سے روک دیتی ہے۔ بالارادہ تو مومن غلط قدم اٹھاتا ہی نہیں۔ غلط قدم سہو ونسیان سے ہی اٹھتا ہے اور وہاں وہ جو نفسِ لوامہ ہے‘ وہ روک دیتا ہے کہ غلط قدم اٹھ گیا ہے۔ اور وہ رکتا ہے‘ پھر واپس لوٹتا ہے‘ پھر اس چوراہے پہ پہنچتا ہے جہاں سے اس نے غلط قدم اٹھایا تھا‘ غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ توبہ ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ کچھ ابھی تک منفی ہے‘ یہ Negative ہے۔ جو غلطی کی تھی صرف اس کا ازالہ ہوا ہے۔ صحیح راستہ ابھی نہیں آیا۔ اس کے بعد اس چوراہے سے جب وہ اس راستے پہ قدم رکھے گا جو اس کی منزل کی طرف جاتا ہے تو یہ عملِ صالح ہوگا۔ اسی لیے قرآن میں توبہ اور عملِ صالح دونوں اکٹھے آئے ہیں۔ ضمیر نے یہ کیا کہ وہ اسے یہاں تک لے آیا۔ اب اس کی تعلیم‘ قرآن کے حقائق‘ اس کے سامنے ہیں‘ وہ بتاتے ہیں کہ اسے کس طرح اس پر عمل کرنا ہے لہٰذا اس طرف جب انسان گامزن ہو جاتا ہے تو پھر یہ صحیح راستے پر چل پڑتا ہے۔ قرآن کی رو سے صحیح اور غلط‘ حق اور باطل‘ جائز اور ناجائز‘ خیر وشر‘ کے امتیاز کا Process (طریق عمل‘ طریق کار) یہ ہے۔ ان میں سے ایک کو چھوڑنے کا اور دوسرے کو اختیار کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن نے اس نفس لوامہ کو شہادت میں پیش کیا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ لیکن میں پھر عرض کر دوں کہ اگر ہم نے اس نفس کی ترتیب ہی غلط انداز میں کی ہے‘ تو سب سے بری چیز بھی یہی ہے۔ ضمیر کی آواز سے‘ اندر کی آواز سے‘ انسان مطمئن ہو جاتا ہے حالانکہ وہ باطل کی آواز ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ [1] (75:3)۔ یہ بات تھی کہ وہ جوان کا انکار تھا وہ تو پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔

---

[1] کیا انسان اپنے دل میں یہ خیال کیے بیٹھا ہے کہ جب وہ مر مرا کر ختم ہو جائے گا تو دوبارہ زندہ نہیں ہوگا؟ (36:78; 37:16)۔ (اور اس طرح وہ اپنے غلط اعمال کی پاداش سے بچ جائے گا۔) کیا وہ سمجھتا ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے‘ وہ موت سے منتشر ہو جاتی ہے اور پھر مجتمع نہیں ہو سکتی؟ یہ اس کا خیالِ خام ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

خواہش کا پیدا ہونا بھی ایک نشان قائم کرتا ہے:

عزیزانِ من! میں عرض کیے چلا آ رہا ہوں کہ دین کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے: انسان کا ہر کام حتیٰ کہ ہر ارادہ، ہر خواہش، ہر آرزو، خواہ وہ ناتمام ہی کیوں نہ ہو، دل میں خواہش کا پیدا ہونا، ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ غلط کام و عمل و ارادہ غلط نتیجہ پیدا کرے گا اور صحیح عمل کا صحیح نتیجہ۔ جسے خدا نے غلط اور صحیح قرار دیا ہوا ہے وہی حقیقت میں غلط اور صحیح ہے۔ ہر عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے نتائج اس زندگی کے اندر ہی سامنے آنے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ اِس اور اُس زندگی کا فرق ہمارا پیدا کیا ہوا ہے۔ زندگی جوئے رواں است، رواں خواہد بود۔ یہ زندگی تو ایک چلتی ہوئی ندی ہے۔ اسے محض، یونہی کہی ہوئی کوئی بات نہ سمجھو۔ پہلے وہ اس دیوار سے باہر تھے؟ اب اس موت کے بعد وہ دیوار کے نیچے سے اندر آ گئے۔ اب آپ دیوار کو دیکھ کر کہہ رہے ہیں کہ زندگی ختم ہو گئی۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ انسان کے اعمال کے جو نتائج ہیں وہ اسے بھگتنے پڑتے ہیں اور اعمال میں میں نے عرض کیا ہے کہ خیالات اور ارادے بھی آ جاتے ہیں۔ انسان کو ان کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اچھے ہیں تو ان کا اچھا نتیجہ، غلط ہیں تو برا نتیجہ۔ اب وہ نتیجہ یہاں بھی مرتب ہوتا ہے، آگے بھی چلتا ہے، بلکہ آگے چل کر میں عرض کرونگا کہ قرآن نے کہا ہے کہ وہ جنت اور جہنم تو انسان کے اندر کا نفس یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہاں مستور ہوتا ہے، وہاں ظاہر ہو جاتا ہے۔ یعنی یہاں وہ نتیجہ چھپا ہوا ہوتا ہے، وہاں بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کے دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ جہنم تو تمہیں اب بھی دیکھ رہی ہے، تم اسے نہیں دیکھ رہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ اس کے لیے قرآن نے مختلف مقامات پہ سمجھایا ہے۔ جو اس کے منکر تھے کہ نہیں صاحب! جو مر گیا، مر مرا گیا، اس کی ہڈیاں، جسم، کھال، بال، ختم ہو گئے اور کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ ان سے بھی یہ کہا کہ جس خدا نے تمہیں Nothingness (عدم) سے پیدا کیا ہے، وہ اس پہ قادر ہے کہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر دے۔ یہ بڑی عمدہ علمی دلیل ہے۔

عدم کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا:

عزیزانِ من! اب تک کا علم اور اس کے بعد بھی ایسا نظر آئے گا کہ انسان کا انتہائی علم بھی، یہ نہیں بتا سکے گا کہ جسے عدم (Nothingness) کہتے ہیں، اس کے معنی کیا ہیں۔ Nothingness (عدم) کا ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا کہ کچھ نہ ہو اور شے بھی پیدا ہو جائے۔ یہ جو ہمارے ہاں کی محسوس عالم کی دنیا ہے اس میں کچھ تو ہو، جس سے بات کچھ آگے بنے۔ خوبصورت بات ہے: لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں ''لگاؤ''، جب کچھ بھی نہ ہو تو دھوکا کھائیں کیا'' [1] ''لاگ'' ہو تو اس کو ہم سمجھیں ''عداوت''۔ Nothingness (عدم) سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آج بھی بڑے سے بڑا Scientist (سائنسدان) یہ دیکھتا ہے تو مبہوت ہو جاتا ہے، وہ وہاں تک تو Cause & Effect کی، علت اور معلول کی، کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے کہ اس سے یہ بنا پھر اس سے یہ بنا، اس آکسیجن اور ہائیڈروجن کے دو ''قطروں'' سے پانی کا ایک قطرہ بن گیا۔ یہ آکسیجن کیسے بن گئی؟

---

[1] لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔ (غالب)

یہاں آ کر پھر وہ اور ایک کسان' یا گدھا چرانے والا' دونوں ایک ہی مقام پہ ہوتے ہیں: نہ وہ بتا سکتا ہے' نہ یہ بتا سکتا ہے۔

قرآن نے دلیل یہ دی ہے۔ بڑے سے بڑے عالم کے لیے' Scientist (سائنسدان) کے لیے کہا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ Nothingness (عدم) سے Being (وجود) کیسے بن گیا۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کہو گے کہ یہ جو جسمِ انسانی ہے جس طرح سے یہ فرسودہ ہو گیا' خاکستر ہو گیا' اس کا کچھ نہ کچھ تو پھر بھی باقی ہے' راکھ ہی سہی۔ کہتے ہیں کہ ہڈیاں پھس پھسا گئیں' یہی سہی' کیڑے کھا گئے' کیڑوں کے اندر چلی گئیں' او کچھ تو ہے۔ اور تم تو اس مقام پہ کھڑے ہو' جہاں یہ کہتے ہو کہ ''کچھ نہیں'' تھا اور ''وہ کچھ ہو گیا'' تو جو ''کچھ نہیں'' سے ''کچھ کر دینے والا'' ہے کیا وہ اس سے نہیں بنا سکتا؟

عزیزانِ من! قرآن بڑی عجیب دلیل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو چیزیں موجود ہوں' ان کو نئی نئی ترتیب سے' اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر کرتے چلے جانا بس کیا یہ اتنا ہی ہوتا ہے جسے ہم تخلیق Creation کہتے ہیں۔ وہ جو عالمِ امر ہے اس میں ہے کہ کچھ نہ ہو تو کچھ بنا دیا جائے۔ تو کہا کہ کیا وہ یہ نہیں کر سکتا اور اگر ''عظام'' کے معنی ہڈیاں نہیں لینا' تو اس کے بنیادی معنی لیجیے۔ ''عظام'' ''ع ظ م'' سے ہے۔ وہ بڑی مضبوط سخت شے' جس کے اوپر کوئی عمارت اٹھتی ہے' وہ بنیاد کا پتھر ہو جاتا ہے۔ ان عربوں کے ہاں زمیندار کے ہل کے نیچے' وہ اس کے اندر بہت سخت لکڑی لگاتے تھے۔ وہ لوہے کا پھالا ہوتا تھا۔ یہ ''عظم'' کہلاتا تھا۔ میں یہ ''ظ'' کے ساتھ ''عظم'' والی بات کہہ رہا ہوں' ''ز'' کے ساتھ نہیں۔ یہ ''بنیادی چیز'' ہے۔ کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس چیز پہ انسان کی زندگی کی بنیاد ہے' تم اوپر کی عمارت کو دیکھ کر کہتے ہو کہ یہ تو ختم ہو گئی۔ وہ جو بنیاد ہے وہ تو ہم نے Nothingness (عدم) سے پیدا کی تھی۔ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پہ پھر عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ یہ ہے دلیل' جو دی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القیٰمۃ کی تیسری آیت تک ہی آج آئے۔ میں سمجھتا ہوں کچھ کام کی باتیں ہو گئیں۔ آیت 4 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ (2:127)

❀...❀❀❀...❀

سانحہ ارتحال

بزم کراچی کے محترم محمد ریاض قریشی صاحب طویل علالت کے بعد 3 دسمبر 2019ء بروز منگل انتقال فرما گئے ہیں۔ محترم قریشی صاحب کا شمار، طلوعِ اسلام کے قدیم ساتھیوں اور کراچی بزم DHA کے بانی ارکان میں ہوتا ہے۔ مرحوم کی خدمات تادیر یاد رکھی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ بزم کراچی اور ادارہ طلوعِ اسلام مرحوم کے اہل خانہ اور اعزہ و اقرباء کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کشمیر اور برما کے مسلمانوں کی مدد کرنا، اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے

کشمیر اور برما کے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم وستم اور بربریت ہورہی ہے اس کی خبریں پڑھ کر، ان کے حالات T.V چینلز پر دیکھ کر کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ ان پر یہ سارے مظالم صرف ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہورہے ہیں۔ لیکن سخت رنج وافسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام ممالک، مسلمانوں کی پوری آبادی، اس قدر بے بس اور لاچار ہے کہ وہ ان کی مدد نہیں کرسکتی۔ مسلمانوں کی بے غیرتی اور بے حمیتی کا اس سے بڑا امتحان نہیں ہوسکتا کہ سب مل کے بھی اس معاملہ میں بالکل بے بس ہیں۔ قرآن کریم نے جو وعدے مسلمانوں کی مدد کرنے کے کئے ہیں ان میں سے ایک وعدہ پر بھی عمل نہیں ہورہا ہے۔ کیا نعوذ باللہ، اللہ کے وہ وعدے جھوٹے ہیں قرآن نے فرمایا: وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (3:139)، ترجمہ: اور سُست نہ ہو اور غم مت کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ (30:47)، ترجمہ: مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم مومنین کو غالب رکھیں گے۔ نیز یہ بھی ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ (4:141)، ترجمہ: اور اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا۔ اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ کافر مسلمانوں پر غالب نہیں آسکتے۔ یہ اور اس قسم کی بیشمار آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں اللہ کی طرف سے مدد ملنے کے وعدے کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم کی ان آیات کو جب ہم تلاوت کرتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ ان آیات کی موجودگی میں مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہوگئی ہے۔ ہم مسلمانوں میں Free Thinkers حضرات ہیں۔ وہ تو پہلے سے ہی ان آیات پر شک وشبہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے علماء کرام بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب تلاش کریں، اور ان آیات کی صداقت کو ثابت کریں وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ مسلمانوں نے قرآن چھوڑ دیا ہے اس لئے ان پر یہ زوال آیا ہے اور یہ کہہ کر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض منصبی ادا کردیا ہے۔ لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے، اور یہی اصل سوال بھی ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا کیوں ہے۔ ایک تو قرآن وحی الٰہی ہے دوسرے یہ کہ اس نظام کے بہترین نتائج سامنے آئے تھے، تو پھر

مسلمانوں پر وہ کون سی مصیبت نازل ہوئی تھی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ نیز یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ چین کا ملک ہمارے آزاد ہونے کے دو سال بعد آزاد ہوا ہے۔ وہ اس عرصہ میں کہاں پہنچ گیا ہے اور ہم کہاں زوال کی حدوں کو چھو رہے ہیں۔ چین نے کونسا قرآن پکڑ رکھا ہے کہ اس نے اس عرصہ میں اتنی ترقی کر لی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے عقائد ہی قرآن کے خلاف ہیں۔ ہمارے عقائد کوئی قوم بھی اختیار کرے، ''ان شاء اللہ'' اس کی یہی حالت ہو جائے گی جو آج ہم مسلمانوں کی حالت ہے۔ ہمارے علماء کرام ان باتوں پر غور نہیں کرتے اس لئے مسلمانوں کی تیرہ سو سال سے یہی حالت ہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے علماء و مجتہدین، بڑے بڑے مفکرین پیدا ہوئے اور سب نے مسلمانوں کو اس حالت سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن کسی ایک مفکر کی فکر بھی کام نہ آئی۔ بلکہ زوال کا جو سبب تھا اس کو اور زیادہ مضبوط تھام لیا۔ یہ اس صدی کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس صدی میں تحریکِ طلوعِ اسلام وجود پذیر ہوئی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے زوال کا سبب بھی واضح کیا اور اس زوال سے باہر نکلنے کا طریقہ بھی بہت وضاحت سے بیان کیا لیکن افسوس کہ ہماری پیشوائیت نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

زمانۂ نزول قرآن کے دوران ہر طرف، اور ہر مذہب میں روح اور روحانیت کا ہی تصور اور اس کا ہی چرچا تھا۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن قرآن روح انسانی کا منکر ہے۔ لیکن مسلمانوں نے قرآن کریم کی اس تعلیم کے علی الرغم روحِ انسانی اور روحانیت کے عقیدے کو اختیار کیا اور روحانیت کے فروغ کو ہی زندگی کا مقصد قرار دیا۔ مسلمانوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ اس کی ترویج اور اس پر عمل کرنے سے ضائع ہی ہوئے۔ حجۃ الاسلام، امام غزالی کی اس معاملہ میں ایک منفرد حیثیت ہے۔ وہ اپنی ابتدائی عمر میں ایک فلسفی تھے۔ فلسفہ کا انہوں نے دفاع کیا اور اس پر ہی انہوں نے کام کیا۔ فلسفہ کے دفاع میں انہوں نے ایک بلند پایہ کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' تصنیف کی۔ جو تصنیف ہونے کے ایک ہزار سال بعد تک اس دور تک بہت اہم سمجھی جاتی ہے، اور اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ پھر امام غزالی فلسفہ سے بدظن ہوئے اور روحانیت کے حلقہ میں داخل ہو گئے، اور اس کے بعد انہوں نے فلسفہ کی اور خود اپنی کتاب ''مقاصد الفلسفہ'' کی تردید کر دی اور فلسفہ کی تردید میں بھی انہوں نے ایک کتاب ''تہافتہ الفلاسفہ'' تحریر کی جس میں انہوں نے فلسفہ پر اکیس (21) اعتراضات وارد کئے۔ یہ کتاب بھی بہت علمی اور معیاری ہے اور اب بھی ایم اے فلسفہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ امام غزالی کی ابتدائی نصف زندگی فلسفے کے دفاع اور اس کے فروغ میں گزری اور آخری نصف زندگ فلسفہ کی تردید اور تصوف کی تائید میں گزری۔ حاصل زندگی صرف صفر ہوا۔ اس کے باوجود ان کے نام کے ساتھ ''حجۃ الاسلام والمسلمین'' اور ''امام'' کے سابقے تحریر کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ جتنے بڑے بڑے علماء اور اولیاء اللہ گزرے ہیں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تصوف زدہ تھا اور اس چیز نے ہی قوم کو غارت کیا ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خانوادے کا بڑا چرچا ہے۔ یہ سب

تصوف زدہ تھے۔شاہ صاحبؒ مرحوم کی ایک کتاب ''انفاس العارفین'' ہے جو صوفیوں میں بہت مقبول ہے۔آپ اس کتاب کو مطالعہ فرمائیں۔انہوں نے جو واقعات اپنے والد اور اپنے چچا کے متعلق تحریر کئے ہیں کوئی بھی Sane آدمی ان کو درست نہیں سمجھ سکتا۔روحانیت تصوف کی ایک اصطلاح ہے اور تصوف خود اسلام کے خلاف ہے۔ہمارے صدر اوّل کے لٹریچر میں تصوف یا روحانیت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔جب مسلمانوں میں غیر قرآنی نظریات داخل ہوئے تو ان کو دین کا جزو بنالیا گیا۔دین کا مقصد انفرادی طور پر سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی ہے اور اجتماعی طور پر مستقل اقدار پر مبنی ایک نظام کا قیام ہے۔قرآن کریم نے حضور ﷺ کے سلسلہ میں بھی روحانیت کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق ارشاد فرمایا: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (68:4) ترجمہ: یہ حقیقت ہے کہ آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔قرآن کریم نے رہبانیت کے متعلق فرمایا کہ یہ انسانوں کا خود ایجاد کردہ عقیدہ ہے اللہ کا تجویز کردہ نہیں ہے۔

زندگی (The Life) لاکھوں سال میں، آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، منزل بہ منزل، جمادات، نباتات کے مراحل طے کرنے کے بعد حیوانیت کی حدود میں داخل ہوئی۔زندگی جب حیوانیت کی سطح بھی عبور کر کے آگے بڑھی اور انسانیت کے دائرہ میں داخل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک Energy ایک صلاحیت عنایت فرمائی جس کو قرآن نے اپنی اصطلاح میں روح کے لفظ سے پکارا ہے۔یہ صلاحیت جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب رہتی ہے تو قرآنِ کریم اس کے لئے روح کا لفظ استعمال کرتا ہے۔اور جب یہ صلاحیت نوعِ انسانی کو مل جاتی ہے تو قرآنِ کریم اس کے لئے نفس کا لفظ کہنا شروع کر دیتا ہے۔صلاحیت تو یہ ایک ہی ہے لیکن ان دونوں الفاظ کے استعمال میں بہت باریک فرق ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع کے مجموعی طور پر ملتی ہے تو یہ نفس کے لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ہمارے علمائے کرام تقریباً ساری دنیا کے لوگوں کو جسم اور روح کا مرکب کہتے ہیں۔لیکن یہ شرف تحریکِ طلوعِ اسلام کو ہی حاصل ہے کہ اس تحریک نے روح اور نفس کے اس فرق کو Defect کیا اور یہ تحریک اس نتیجہ پر پہنچی کہ قرآن کے مطابق انسان ''جسم اور نفس'' کا مرکب ہے۔قرآنِ کریم چونکہ روح انسانی کا قائل ہی نہیں ہے اس لئے قرآن نے روحِ انسانی کی development کے اصول بھی نہیں بتائے۔ہمارے علماء اور صوفیائے کرام نے خود اپنے آپ ہی روح کی development کے اصول مقرر کر لئے۔لیکن انہوں نے جو عقائد و اصول وضع کئے وہ سب انسانیت کو زوال پذیر کرنے، اور اس کو تباہ و برباد کرنے کے ضامن ہیں۔

(1) قرآنِ کریم نے فرمایا کہ یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (29:44) اللہ نے آسمان و زمین بالحق پیدا کئے اس میں مومنین کے لئے نشانی ہے۔دوسرے مقام پر ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

مِنَ النَّارِ ﴿38:27﴾، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا (کائنات کے باطل ہونے کا) ان لوگوں کا خیال ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ پس ان لوگوں کے لئے جو انکار کرتے ہیں تباہی ہے۔ ان واضح آیات کے باوجود ہمارے صوفیائے کرام اور روحانین اس کائنات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہماری اردو زبان، اور فارسی زبان کی ساری شاعری اسی نظریہ پر قائم ہے کہ کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

غالب کی تو ساری شاعری ہی وحدت الوجود کے عقیدے پر مبنی ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

آپ خود اندازہ فرمائیں کہ یہ حضرات جب کائنات کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتے تو یہ سائنس میں کیا ترقی کریں گے؟ اور کائنات کی قوتوں سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی عقیدہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں سائنسدان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ روحانین کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ وہ عقل وحواس سے حاصل کردہ علم کو علم ہی تسلیم نہیں کرتے وہ صرف اس علم کو علم تسلیم کرتے ہیں جو باطنی ذرائع سے حاصل ہو۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں تحریر کیا ہے:

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

گر بہ استدلال کارے دیں بُدے فخر رازی راز دار دیں بُدے

حالانکہ قرآن نے علم اس علم کو کہا ہے جو انسانی شعور وعقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے فرمایا: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿17:36﴾، تمہیں جس بات کی خبر نہیں اس کے پیچھے نہ پڑو بے شک کان، آنکھ اور عقل ان سب کی تم سے پوچھ گچھ ہوگی۔ قرآن تو علم ہی اس کو کہتا ہے جو عقل وشعور کے ذریعے حاصل ہو۔ لیکن ہمارے یہ صوفیاء اس کو علم تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ جو علم کشف والہام، والقاء سے حاصل ہوتا ہے، اس کو علم گردانتے ہیں۔

(3) انہوں نے مادہ کو روح کے بالمقابل کھڑا کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ترقی ایک ہی چیز میں ہوسکتی ہے۔ ان کے خیال کی رو سے روحانیت میں اسی وقت ترقی ہوسکتی ہے جب مادہ کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ یہ حضرات

ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولا، ترکِ ترک

کے قائل ہیں۔ انہوں نے پرستش کو روحانیت کی ترقی کا ذریعہ بنایا ہے جو جنگلوں، پہاڑوں، کونوں، گوشوں اور زاویوں میں اور وظائف کے ذریعے کی جاتی ہے۔ روحانین کو کسی معاشرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اُنہیں کسی بھی نظام سے کوئی بحث نہیں۔ خواہ نظام وجمہوریت کا ہو یا کمیونزم کا، ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ وہ نظریات وعقائد ہیں جنہوں نے مسلمانوں

کو تباہ برباد کر کے رکھ دیا۔ چین کے ملک میں اس طرح کے عقائد کی کوئی گنجائش نہیں جس کی وجہ سے انہوں نے ترقی کی ہے۔ ان تمام عقائد کے برعکس و برخلاف نفس کا قرآنی تصور ہے جو دنیا میں سب سے پہلی بار قرآن نے پیش فرمایا ہے۔ قرآنِ کریم روح کی بجائے نفس کو Recognize کرتا ہے اور نفس کی ترقی کے ذرائع وطریقے بھی خود ہی تجویز کرتا ہے۔ نفس انسانی کی ترقی کے دو ذرائع ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ ہر شخص قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اسلامی نظام کی اساس مستقل اقدار پر ہوتی ہے۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ذات میں نشوونما بھی ہوتی ہے اور اس سے تمدنی نظام کا نظم ونسق بھی اچھا ہو جاتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے ہم آپ کے سامنے مستقل اقدار کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

جب ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں تصادم (Tie) پڑ جاتی ہے تو ذاتی مفاد کو مستقل اقدار پر قربان کر دینے سے ذات میں نشوونما ہوتی ہے مستقل قدر یہ ہے کہ آدمی حلال کی کمائی کھائے اور حرام کی کمائی سے اجتناب کرے۔ اب فرض کیجئے کہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوں اور مجھے اپنے بیٹے کو کالج میں داخل کرنا ہے۔ لیکن میرے پاس داخلہ کی رقم نہیں ہے اور میں اس معاملہ میں بالکل مجبور ہوں۔ عین اس وقت ایک سائل میرے پاس آتا ہے اور اپنا کوئی کام کرانے کے لئے ایک رقم کی پیشکش کرتا ہے۔ اب میرے پاس دو Option ہیں ایک تو یہ کہ میں مستقل قدر پر عمل کروں اور اس شخص سے رقم وصول نہ کروں اور اپنے مفاد پر مستقل قدر کو ترجیح دوں، اس سے میری ذات کی نشوونما ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں اس سائل سے وہ رقم بطور رشوت وصول کرلوں اور اپنے ذاتی مفاد کو مستقل قدر پر ترجیح دوں۔ اس صورت میں میری ذات کی نشوونما رک جائے گی۔ اس مستقل قدر پر عمل کرنے سے میری ذات کی پختگی بھی ہوگی اور اس سے معاشرہ کا نظم ونسق بھی اچھا ہوگا اور معاشرہ میں رشوت ختم ہو جائے گی۔

(2) ایک اچھے معاشرہ میں افسران ونمائندگانِ قوم اس معاشرہ میں امن وامان قائم کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ ذمہ داری ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہوں۔ اسے غیر ذمہ داروں کے سپرد نہ کیا جائے اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ (4:58) یہ ایک مستقل قدر ہے۔ جب کوئی شخص اس مستقل قدر پر عمل کرتا ہے اور اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو معاشرہ خود اس سے بہتر ہوتا ہے۔

(3) وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ (2:219) تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی سے دوسروں کی فلاح وبہبود کے لئے کس درجہ کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ اپنی ضرورت سے زیادہ سب دوسروں پر صرف کر دو۔ یہ ایک مستقل قدر ہے۔ اس قدر پر عمل کرنے سے ذات کو بھی استحکام ملتا ہے اور معاشرہ بھی بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔

(4) وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ (2:177) ترجمہ: جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔ یہ ایک مستقل قدر ہے اس پر عمل کرنے سے ذات میں بھی استحکام ہوتا ہے اور معاشرہ کا نظم ونسق دونوں درست ہوتے جاتے ہیں۔

(5) ارشادِ عالی ہے: اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۠ (5:8) ترجمہ: عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے یہ ایک مستقل قدر ہے جس پر عمل کرنے سے ذات کا استحکام اور معاشرہ کا نظم ونسق دونوں وجود پذیر ہوتے ہیں۔

نفس کی نشوونما کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ رب ہے ہر انسان کو دوسروں کی ربوبیت کرنی چاہئے اللہ تعالیٰ رزاق ہے۔ ہر شخص کو دوسروں کو رزق مہیا کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کریم، رحیم، ستار، غفار، عزیز وغفور ہے۔ ہر شخص کو یہ عادتیں علیٰ حدِ بشر اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں۔ ان صفات کو اپنی عادت بنانے سے، اور رات دن ان پر عمل کرنے سے ذاتِ انسانی کی نشوونما ہوتی ہے، اور ان پر عمل کرنے سے معاشرہ بہتر سے بہتر ہوتا جاتا ہے۔ صفاتِ خداوندی معاشرتی نظم میں خوابیدہ (Dormant) رہنا نہیں چاہئیں۔ ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ اور سارے معاشرہ میں یہ نافذ اور جاری وساری ہوں۔ جس معاشرہ میں ان صفات پر عمل ہوگا اس سے بہتر معاشرہ بن ہی نہیں سکتا۔

صفاتِ خداوندی کو روبہ عمل لانے اور مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ریاست خود بخود اسلامی وقرآنی بن جاتی ہے۔ اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس میں نفس انسانی استحکام حاصل کرتی ہے۔ غیر اسلامی نظام میں ذات کی نشوونما ہی نہیں ہوسکتی۔ قرآنِ کریم نے اسلامی نظام کے قیام کو ہر شخص کے لئے فرض قرار دیا ہے (5:44، 42:13) چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات القوی، العزیز ہیں اس لئے اسلامی ریاست دوسری تمام ریاستوں سے مضبوط اور طاقتور ہوگی۔ قرآن کی ایک مستقل قدر یہ ہے کہ: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ (8:60) اور مسلمانو ان کفار کے مقابلہ کے لئے جہاں تک تم سے ہوسکے، اپنے بازو کے زور سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے لڑائی کا سامان مہیا کرو۔ اس سے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن اور اس کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی اپنی دھاک بٹھاؤ، جنہیں تم جانتے تک نہیں ہو۔ قرآن کریم کا یہ حکم ہے کہ اپنی حکومت قائم کرو اور وہ اتنی مضبوط ہو کہ دوسری حکومتیں اس سے ڈرتی رہیں۔ ترھبون بہ تم اس قوت کے ذریعہ دوسری حکومتوں کو ڈرائے رکھو۔

بہت عرصہ کی بات ہے کہ امریکہ کا ایک Cruiser (جنگی جہاز) کراچی پورٹ پر لنگر انداز ہوا۔ پاکستانی حکومت اور عوام اس کی آمد پر ناراض تھے اور اس کی آمد کے خلاف ایک جلوس صدر بازار میں نکالا گیا جس میں امریکن حکومت کے خلاف بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ اس جہاز میں جو امریکن سٹاف تھا وہ وقت گزاری کے لئے شہر میں گھومنے لگا۔ چند

امریکن اس جلوس کے قریب بھی آ گئے۔ اُنہیں اس جلوس کے نکالنے کا سبب بھی معلوم تھا وہ ازراہِ تفریح اس جلوس کے ساتھ چلتے بھی رہے۔ لیکن چونکہ وہ امریکن تھے جو کہ ایک سُپر پاور ہے، کسی ایک شخص کی یہ جرأت نہیں ہوسکی کہ کوئی ان پر ہاتھ ڈال سکے۔ تشکیلِ پاکستان سے پیشتر چند صحافیوں نے قائداعظم سے یہ دریافت کیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان کے باقی ماندہ مسلمانوں کی حفاظت کی کیا صورت ہوگی۔ تو قائداعظم نے فرمایا تھا کہ جس قدر پاکستان کی حکومت مضبوط ہوگی۔ اسی قدر ہندوستان کے مسلمان Secure ہوتے چلے جائیں گے۔

اسلامی نظام جس کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ ہر طرح کی قوت جمع رکھو (8:60) تاکہ تمہارے دشمنوں پر تمہارا رعب طاری رہے۔ جو دشمن تمہارے سامنے ہیں صرف ان پر ہی تمہارا رعب نہ ہو بلکہ ان دشمنوں پر بھی رعب رہے جنہیں تم جانتے تک نہیں ہو۔ جب تمہاری ریاست میں اتنی قوت ہوگی تو تمہارا فرض ہے کہ تم خود ساری انسانیت کی نگرانی کرو۔ فرمایا: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143) ترجمہ: اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تم ساری انسانیت کی نگرانی کرو اور تمہارا (اور اس رسول کے بعد اس کا جانشین تمہاری نگرانی کرے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک مضبوط اسلامی ریاست موجود ہو تاکہ وہ ساری انسانیت کی نگرانی کرے اور جہاں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو وہ مظلوم کو ظالم کے ظلم سے بچائے سورہ الحج میں ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ (22:38) ترجمہ: اللہ تعالیٰ مومنوں کی حفاظت کرتا ہے اور مومنوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹا دیتا ہے۔

ہم نے اس مضمون میں بار بار تحریر کیا ہے کہ اللہ مومنوں کی مدد کرتا ہے اللہ کفار کو مومنوں پر غالب نہیں آنے دیتا۔ اللہ مومنوں کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ یہ کام خود زمین پر آ کر سرانجام نہیں دیتا۔ وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے کام انسانوں کے ذریعے ہی پورا کراتا ہے۔ یہ جو قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) (زمین کے اوپر کوئی نفس ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ بے شک اللہ ہر نفس کو رزق مہیا کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ آسمان سے روٹیاں پکوا کر نہیں پھینکتا، نہ زمین پر خود آ کر ہر شخص کو رزق دیتا ہے۔ بلکہ اس کا نظام اس کے Behalf پر یہ سارے کام سرانجام دیتا ہے۔ اللہ کے پروگرام انسانوں کے ہاتھوں پورے ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت چونکہ اللہ کے نام پر قائم ہوتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدے کئے ہیں یہ مملکت ان تمام وعدوں کو پورا کرتی ہے۔ جب مدینے میں اسلامی مملکت قائم ہوگئی تھی تو وہ مسلمان جو مکہ میں باقی رہ گئے تھے اور وہ مدینے ہجرت نہیں کر سکے تھے تو کفار نے ان پر بہت مظالم ڈھائے تو ان مکی مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کی کہ اللہ ہماری مدد فرما اور ہمیں ان کفار کے ظلم سے بچا اور ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں۔ تو اللہ نے ان مکی مسلمانوں کو مکہ سے خود نہیں نکالا بلکہ مدینے کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ

وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ (4:75) ترجمہ: اور (اے مسلمانوں) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان کمزوروں اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو کفار کے ہاتھوں سے چھڑانے کے واسطے جہاد نہیں کرتے جو (حالت مجبوری میں) خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی (مکہ) سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا اور تو خود ہی کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار بنا۔ اللہ کے حضور ان مظلوموں کی دعا قبول ہوئی اور مدینے کی اسلامی مملکت نے ان کی مدد فرمائی۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ جس خطے میں بھی ہو۔ اگر مظلوم اس کو اپنی مدد کے لئے پکاریں۔ تو وہ ان کی مدد کرے۔ اس میں مسلمان ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ دنیا میں کسی مظلوم کی آواز کسی طرف سے بھی اُٹھے۔ اسلامی مملکت اس کی مدد ضرور کرے گی کیونکہ اس امت کے لئے فرمایا گیا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) ترجمہ: تم بہترین قوم ہو تمہیں تمام نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس آیت میں لِلنَّاسِ کا لام، لام نافع کہلاتا ہے۔ یہ لام نفع مندی کے لئے استعمال ہوتا ہے پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے تمہیں پیدا کیا گیا ہے تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) تمہارا فریضہ یہ ہے کہ پوری انسانیت کے اندر تم جتنی چیزیں خدا کے قوانین کے مطابق Recognize کی گئی ہیں ان کا حکم دو، تامرون کے معنی حکم دینا ہے وعظ کرنا نہیں ہے۔ تمہارے میں اتنی قوت ہو اور تم اس پوزیشن میں ہو کہ حکم دے سکو اور وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110)۔ تمہارے پاس اتنی قوت ہو کہ ہر وہ بات جو خدا کے قانون کے خلاف ہو اس کو روک سکو۔ یہ ہے وہ مسلمان قوم جو مظلوم کی مدد کرتی ہے۔

قرآن کریم میں جس قدر احکامات دیئے گئے ہیں وہ یہ Suppose کر کے دیئے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک طاقتور مملکت موجود ہے اور وہ ان احکامات پر عمل کرا سکتی ہے۔ انسانوں کا کوئی گروہ یا کوئی انبوہ اس قسم کے احکامات پر عمل نہیں کرا سکتا۔ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ برما کے مسلمانوں کی مدد کریں لیکن اس وقت مسلمان خود اس قابل نہیں کہ اور کسی کی مدد کر سکیں نہ ہی وہ کسی قوم کی دادرسی کر سکتے ہیں۔ مسلمان تو خود اپنے قابل بھی نہیں کیونکہ مسلمان تو پرستش کے مرض میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے اللہ کی اطاعت کو مساجد تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ اللہ کی اطاعت مساجد کی بجائے مملکت کی مختلف اداروں کی اطاعت کرنے سے ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کے تھانے، تحصیلیں، عدالتیں، پارلیمنٹ یہ وہ ادارے ہیں جہاں سے قوانین خداوندی جاری ہوتے ہیں اور یہ سب مساجد اللہ ہیں ہر وہ ادارہ جو قوانین خداوندی جاری کرتا ہے۔ اس کی اطاعت اقامت صلوٰۃ کے زمرہ میں آتی ہے۔ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ کے ان اداروں میں قوانین خداوندی کو جاری رکھنے کے لئے مشورے کئے جاتے ہیں (42:38) جبکہ ہمارے ہاں مسجد و نماز میں بات کرنا بالکل منع

ہے۔

اس مضمون کا ملخص یہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے دو اسباب ہیں۔ ایک سبب روحانیت کا عقیدہ ہے اور روحانیت کے حصول کے لئے پرستش کرنا اور دوسرا سبب اسلامی نظام کا انقراض (اُلٹ) ہے جب تک مسلمان روحانیت کے عقیدے کو ترک کر کے، دین کا نظام قائم نہیں کریں گے نہ اللہ کے وعدے پورے ہوں گے جو دین کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ نہ مسلمانوں کی حالت درست ہوگی۔ اور نہ یہ کسی کی مدد کرنے کے قابل ہوں گے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اللہ کی اطاعت کا ایک ہی طریقہ ہوسکتا ہے۔ اس کی اطاعت کے دو مختلف دو متضاد طریقے نہیں ہوسکتے۔

جو مسلمان روحانیت کے قائل ہیں۔ وہ اللہ کی اطاعت پرستش کے ذریعہ کرتے ہیں اور وہ اطاعت اور پرستش کے فرق کو نہیں سمجھ سکتے اور عبادت کے معنی پرستش یا پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ (16:114) کا ترجمہ اگر تم اس کو پوجتے ہو کیا ہے۔ قرآن کریم اطاعت خداوندی کا طریقہ اس کے نظام کی اطاعت کو قرار دیتا ہے۔ نظام کی اطاعت کے علاوہ اللہ کی عبادت کسی اور طریقہ سے ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اسلامی نظام کے ہر حکم کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہے۔ جب آپ اسلامی نظام کے احکامات کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ ہی عبادت خداوندی ہے۔ پھر پرستش کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جب آپ قرآنی معاشرتی نظام کے Revenues ادا کرتے ہیں، بجلی کا بل، پانی کا بل، ٹی وی اور کمپیوٹر کا بل ادا کرتے ہیں تو یہ عبادتِ خداوندی ہوتی ہے جب تک آپ نظامِ خداوندی کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی نہیں قرار دیں گے، اس وقت تک دین قائم نہیں ہوسکتا۔

اس وقت مسلمانوں کے سامنے صرف ایک راستہ باقی ہے کہ آپ روحانی پرستش کو بالکل ترک کر دیں اور اقامت دین کی پوری پوری کوشش کریں۔ جو لوگ جہاں بھی اور جب بھی اقامتِ دین کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا بہت بلند مقام ہوتا ہے۔ ان کا درجہ و مقام والذین معہٗ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اقامت دین میں جن لوگوں نے حضور ﷺ کا ساتھ دیا تھا۔ ان کا جو مرتبہ و مقام تھا۔ اس دور میں اور ہر دور میں اقامت دین کی کوشش کرنے والوں کا وہی مقام ہوگا۔ اقامت دین اور ہجرت کرنے والوں کا ہر دور میں ایک اعلیٰ درجہ ہوگا اس نظریہ میں ہم منفرد نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت معارف القرآن اور تفسیر نمونہ نے بھی اسی طرح کی ہے۔ ان دونوں تفاسیر نے ہمارے موقف کی تائید کی ہے۔

شعورِ آدمیت ناز کر اس ذاتِ اقدس پر
تیری عظمت کا باعث ہے، محمدؐ کا بشر ہونا

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حاصلِ مطالعۂ لغاتُ القرآن

☆ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۪ (20:114) جب تک وحی کی پوری تعلیم سامنے نہ آ جائے اس کے عملی پروگرام میں عجلت مت کرو۔

☆ اَسَف' سے مطلب انتقام کے جذبہ کے ماتحت خون دل کا جوش کھانا ہے۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمتر کے لئے پیش آئے تو غَضَب' کہلاتی ہے اور اگر اپنے سے برتر کے لئے آئے تو حُزۡن' کہلاتی ہے۔

☆ جب مختلف افراد کے سامنے نصب العین حیات ایک ہو' منزل ایک ہو' راستہ ایک ہو' ضابطہ زندگی ایک ہو' تو پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے پیوستگی کیوں نہ ہوگی۔ یہی مومنین کا معاشرہ ہوگا۔

☆ جِبۡت'۔ ہر بے حقیقت اور بے معنی چیز۔ توہم پرستیاں۔ رسومات جن میں روح نہ ہو۔ جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ جو قوم بھی خدا کے الدین کو چھوڑ دیتی ہے وہ جبت اور طاغوت کو اپنا ''معبود'' بنا لیتی ہے۔

☆ ظلم روکنے والا ''جبار'' نوع انسان کے لئے آیہ رحمت اور خیر ہے' اور ظلم کرنے والا ''جبار'' موجبِ عذاب وشر۔

☆ قرآن کریم کی رو سے فرد یا قوم' جس مقام پر رک جائے' وہ جحیم (جہنم) ہے۔

☆ جَدَث' اور مَرۡقَد' (خواب گاہ) ہم معنی ہیں اور مقصود کوئی خاص مقام نہیں' کیفیت ہے۔

☆ خیر وشر کا معیار کتاب اللہ ہے۔ کائنات کی میزان میں فیصلے انسان کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں۔

☆ صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات سے لے کر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ امت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوعِ انسان کی بہبود کے سامان وذرائع پر غور کریں۔

☆ جہنم کا ایندھن سرمایہ پرست اور ان کی وہ دولت ہے جسے وہ نوع انسانی کی منفعت کے لئے عام نہیں کرتے بلکہ انفرادی مفاد کی خاطر جمع رکھتے ہیں۔

☆ چند حدود (Limitations) کے اندر کھلی آزادی۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ دین۔

☆ انسان زمین میں بیج ڈال (حَرث) سکتا ہے اس بیج کو زمین سے اگانا (زَرع) اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

☆ بغیر جبر (اکراہ) اور تنگی (حرج) کے دین میں داخل ہونے کا مطلب اس کے تمام قوانین وضوابط کو بہ طیب خاطر ماننا ہے۔ جبر اور تنگی محسوس ہونے پر نظام کے دائرے سے باہر نکل جانا چاہئے اس لئے کہ دین میں جبر اور تنگی نہیں ہے۔

☆ آخرت، اس مستقبل کا بھی نام ہے جو انقلاب آفرینی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے۔

☆ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں۔

☆ جب تک اسلامی مملکت کا نظام (الدین) قائم رہے، فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب وہ نظام باقی نہیں رہتا تو فرقے پیدا ہونا لازمی ہیں۔

☆ کسی نقصان سے پہلے جو کیفیت ہوتی ہے وہ خوف ہے۔ اس کے بعد غم یا حزن شروع ہو جاتا ہے۔

☆ احسان میں نگاہ واجب (Dues) پر نہیں ہوتی بلکہ مقصد توازن برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔

☆ حق کے معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود ہونا، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے۔ نیز ہر وہ موجود چیز جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو (راغب) قرآن کی شہادت ہے کہ خدا خود حق ہے (10:30)، اس کا رسول حق ہے (3:85)، اس کی طرف سے بھیجا ہوا قرآن کریم حق ہے (34:6)، اس کے وعدے (قوانین) حق ہیں (10:55)، اور یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے (39:5)۔

☆ عام اشیائے فطرت یعنی رزق کے چشمے کو حلال رکھنے کا مطلب ان (Free goods) کو کھلا رکھنا ہے۔ ان کو روک کر (Economic goods) میں تبدیل کرنا ان کو حرام قرار دینے کے مترادف ہے جو کبھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

☆ میں نے (متعدد اسناد کی تائید سے) لکھا ہے کہ اُحْوُرُ جس کی جمع حُوْرٌ ہے کے معنی پاکیزہ عقل (Pure or clean intellect) کے ہیں۔ یعنی چالاک اور مکار عقل نہیں بلکہ پاک اور صاف عقل جو عقل ادب خوردۂ دل ہو۔

☆ حِیلَۃ وہ طریقہ ہے جس سے کسی بات تک پوشیدہ طور پر پہنچا جائے۔ (راغب)۔

☆ ''کلمۃ خبیثۃ'' (غلط نظریہ حیات) دیکھنے میں بالکل صحیح نظریہ کے مطابق نظر آتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

☆ ''خدا فریبی'' ''خود فریبی (Self Deception) کا دوسرا نام ہے، لیکن لوگ اس کا شعور نہیں رکھتے۔

☆ جنسی اختلاط سے مقصد جائز طریق سے افزائش نسل ہے۔

☆ انسان کا فریضہ، قوانینِ خداوندی کی تنفیذ ہے، قوانین سازی کے اختیارات اسے تفویض نہیں کئے گئے۔ خدا کا

رسول بھی دین بنا تا نہیں۔

☆ قرآن کریم نے جو صفات مومن کی بیان کی ہیں، وہی صحیح اخلاق ہیں۔

☆ خمر اور میسر سے صرف انسانی جسم ہی میں اضمحلال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسانی ذات کی توانائیاں بھی افسردہ ہو جاتی ہیں۔

☆ خنزیر (سور) کو دنیا میں ہر جگہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔ خود بائبل میں اس کا ذکر اسی انداز سے آیا ہے۔

☆ خوف کا تعلق مستقبل کے اندیشہ سے ہے اور حُزن بالعموم گزرے ہوئے واقعہ کے غم کو کہتے ہیں۔

☆ جن امور کو تم صحیح اور سچا مانتے ہو ان کے خلاف عمل کرنا (Dual personality) کی علامت ہے یعنی ان باتوں کو ماننے والا کوئی اور ہوتا ہے اور ان کے خلاف کام کرنے والا کوئی اور۔ یہی اپنے آپ سے خیانت کرنا ہے۔

☆ انسانی ترقی تسخیر کائنات سے ہوتی ہے۔ وہ زندگی جس میں شعلہ نہ ہو، راکھ کا ڈھیر ہے۔

☆ ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل کی خوشگواریاں ہوں، خیر ہے۔ خوشگوار کہتے ہی اسے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو۔

☆ خیال درحقیقت اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان خواب میں دیکھے جس کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ اسی لئے تاج العروس نے لکھا ہے کہ الخیال (Scare-Crow) کو بھی کہتے ہیں۔

☆ تخریب کی روک تھام دوسری قسم کی تخریب سے نہیں ہوتی۔ اس کی مدافعت اس سے قوی تر اور موثر تر تعمیر سے ہوتی ہے۔

☆ سورہ بقرہ کی آیت 228 میں جہاں عدت کا ذکر ہے، وضاحت کی گئی ہے کہ جس قسم کے حقوق مردوں کے عورتوں پر (علیہن) اس قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لھن) ہیں۔ یہاں مردوں کی ایک فوقیت عورتوں پر گنوائی ہے کہ عورتوں پر عدت کی قید ہے جبکہ مرد حضرات پر قید نہیں۔

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 4

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

کلیم الزماں اپنے مطالعہ کے کمرے میں کسی سوچ میں بیٹھے ہیں کہ عالم آرا ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑے کمرے میں داخل ہوتے ہی بآواز بلند کہتی ہے۔

عالم آرا: ابو! آج تو آپ پکڑے گئے۔ میں نے ایم اے اسلامیات میں جو کچھ پڑھا ہے آپ کی باتوں نے اس سب پر پانی پھیر دیا ہے۔ میری حالت تو ایسی ہوگئی ہے کہ بقول شاعر "ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں"

کلیم الزماں: بیٹی! جو کچھ تم نے پڑھا ہے وہ گزرے زمانے میں ٹھیک تھا لیکن زمانہ بدل گیا ہے زمانے کے تقاضے بدل گئے، علم کی سطح ہر روز بلند سے بلند تر ہوتی جارہی ہے جو ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس رفعت نگاہ کا ساتھ دیں۔ علامہ اقبال نے قرآن مجید کے متعلق کہا ہے ؎

صد جہانِ تازہ در آیات اوست — عصر ہا پوشیدہ در آنات اوست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

تم نے کبھی سوچا ہے کہ قرآن مجید یا دوسری آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیوں ہوئی ہیں۔

عالم آرا: میں نے تو کبھی نہیں سوچا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبروں اور کتابوں کو نازل کرنے کا مقصد کیا ہے یا تھا۔ اس قسم کے سوالات تو انسان کو لادین بنا دیتے ہیں آپ ہی کچھ بتائیے۔

کلیم الزماں: سنو جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو بکری کے بچے اور انسان کے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں جانور ہوتے ہیں لیکن ایک فرق ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بکری کا بچہ بڑا ہو کر بکری یا بکرا ہی رہتا ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ بکری کو گھاس مل جائے وہ بھی کھا لیتی اور اگر پھولوں کی ٹوکری سامنے رکھی جائے تو اس کو بھی نہیں چھوڑتی اور اگر بیمار ہو جائے تو اپنا علاج نہیں کر سکتی لیکن آدمی کے بچے میں اللہ تعالیٰ نے طبعی زندگی کو محفوظ رکھنے خیر و شر میں تمیز کرنے اور حسین اور قبیح میں امتیاز کرنے کی خاصیت ودیعت کر رکھی ہے جس کی پرورش کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور کتابوں کا سلسلہ شروع کیا جس کا خاتمہ حضور نبی اکرم ﷺ پر ہوا۔ شروع شروع میں معاشرہ سادہ سا تھا۔ لہٰذا قوانین یعنی شریعت کے احکام بھی سادہ تھے۔

جوں جوں معاشرہ کے مسائل پیچیدہ ہوئے اسی حساب سے شریعت کے احکام بھی بدلتے گئے اور سلسلہ اب تک جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ جو لوگ کسی ایک دور کی شریعت کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنا چاہتے ہیں علامہ اقبال کو ان سے اختلاف ہے۔

عالم آرا: ابو! آپ نے کہا تھا کہ قرآن کے الفاظ میں معنویت کی دنیائیں آباد ہیں۔ مجھے آپ مثال دے کر سمجھائیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! بات شروع کی تو لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ میں تم سے پوچھتا ہوں قرآن مجید میں جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم و رحمان ہے۔ تم اس کا مطلب جانتی ہو۔ کہ ان دو لفظوں میں علم کی ایک دنیا مستور ہے اور جس کا انکشاف صرف گذشتہ صدی میں ہوا۔

عالم آرا: میں تو سمجھتی ہوں کہ ان الفاظ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے، اور صاف ظاہر ہے کہ ہم سب اسکی رحمت کے طلبگار ہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! اس سے تو بات نہیں بنتی۔ کسی انگریز کو سمجھانا ہو تو کیسے سمجھاؤ گی۔

عالم آرا: قرآن مجید کے ترجموں میں لکھا ہے "God is Mercy"

کلیم الزمان: بیٹی! اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ سنو عرب ٹھوس Concrete چیزوں کے ساتھ فکری تصورات منسلک کرتے تھے اور قرآن مجید نے یہ طریقہ قائم رکھا ہے۔ لفظ رحیم میں ایک تدریج کا پہلو پوشیدہ ہے جیسے اسی وزن پر تعلیم کا لفظ ہے مختصراً رحیم کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کائنات اور انسان اور اسکے معاشرے کی اس طرح پرورش کر رہا ہے جس طرح ایک عورت اپنے رحم میں اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ اس ایک لفظ میں ڈارون کی تھیوری آف آرگینک ایوولوشن جھلک رہی ہے۔ ہمارے حکماء اور عرفاء نے بہت پہلے اللہ تعالیٰ کے اس عمل کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مثلاً حافظ ابن مسکویہ اور مولانائے روم نے تو صاف لکھا ہے کہ "میں پہلے جمادی حالت میں تھا۔ پھر نباتی حالت میں آیا اس کے بعد حیوانی حالت میں رہا اور اب انسانی حالت میں ہوں۔ اسکے بعد جو بننے والا ہوں کوئی نہیں جانتا۔ ڈارون کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنی theory of Organic Evloution کیلئے ثبوت مہیا کئے، اور پھر لفظ رحمان ہے۔ اس لفظ کے اندر مشہور سائنسدان لائیڈ مارگن کی Theory of Emergent Evolution پوری آب و تاب سے عیاں ہے۔ عربی قاعدے کے مطابق جذبہ یا کیفیت یک بارگی یعنی یک لخت پیدا ہو جائے تو رحمان والا وزن استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دم غصہ آجائے تو غضبان کہا جائیگا۔ اسی طرح فوری اور سخت پیاس کے لئے عطشان بولا جائے گا۔ سائنس کی زبان میں اسے تقلیب (Mutation) کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسی عمل سے بندر نما کسی حیوان کی ایک نسل انسان بن گئی اور دوسری لڑی بندر نما ہی رہی۔ موجودہ زمانے کی تحقیق کے مطابق کچھ انسان ایسے بھی پیدا ہوئے جن کا قد صرف تین فٹ تھا۔ اس مخلوق کے ڈھانچے انڈونیشیا کے کسی جزیرے کے ایک غار میں ملے ہیں۔ اس تحقیق کا ذکر امریکہ سے شائع ہونے والے جریدے ''نیشنل جیوگرافک'' کے اپریل 2005ء کے شمارے میں کیا گیا ہے۔ یہ بحث تمہیں یہ سمجھانے کے لئے ہے کہ کائنات میں مسلسل

ارتقا ہو رہا ہے۔ اور وہ ہر گھڑی خوبصورت سے خوبصورت ہوتی چلی جا رہی ہے اور یہی بات انسانی معاشرے پر بھی صادق آتی ہے جو مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ غالب نے اپنے انداز میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہاں بحث سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار و ارادہ کی خصوصیات بخش کر معاشرے کی ترقی کا انتظام تو کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی معاشرے میں خیر و شر کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اگر سچی بات پوچھو تو شر کو پیدا کرنے میں بھی در پردہ چشم یار کا منشاء کچھ اور ہے کیونکہ شر کی موجودگی کے بغیر خیر کی ترقی سست رفتار رہتی ہے۔ قصہ کوتاہ شر کی شخصی شکل شیطان کی صورت اختیار کر لیتی ہے، یعنی شر اور شیطان مترادف ہیں۔ اس حقیقت کو بھی غالب نے نہایت خوبصورت انداز میں یوں پیش کیا ہے کہ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

عالم آرا: ابو! آپ کی باتیں سن کر میری دنیا بدل رہی ہے۔ دل جھوم رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کوئی نئی چیز مل گئی ہے۔ دل و دماغ میں بجلی کڑک رہی ہے۔ میں اپنی کیفیت بیان نہیں کر سکتی۔

کلیم الزمان: بیٹی! جب میں نے علامہ اقبال کی یہ رباعی پڑھی ؎

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمزدیں را

تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں علامہ کی نگارشات ضرور پڑھوں گا اور علامہ کے شارح علامہ غلام احمد پرویز کو بھی زیر مطالعہ رکھونگا۔ کیا بتاؤں کہ جونہی میں نے رحیم اور رحمان کی تفسیر پڑھی تو ایسا محسوس ہوا کہ نخل سینا پر بجلی کڑکی ہو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ لن ترانی لیکن علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویز کی نگارشات کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے لن ترانی کی آواز نہیں آئی۔ میرے لئے قرآن مجید کا ہر لفظ نخل سینا پر گرنے والی بجلی بن گیا ہے۔ میں تم سے یہی کہونگا کہ تم بھی قرآن مجید اسی طرح پڑھو جس طرح اقبال اور پرویز نے پڑھا تھا۔ قرآن مجید کے مروجہ تراجم اور تفاسیر سے دل و دماغ کی سیرابی نہیں ہوتی۔ علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویزؒ دوسرے علما کی طرح یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی درست ہے بلکہ ان کا موقف ہے کہ جو خیالات انہوں نے پیش کئے ہیں ان سے بہتر خیالات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہی بات ہو گئی کہ ؎

چوں کہن گردد جہانے دربرش می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب میں دوسری طرف آتا ہوں جس کے لئے تم انتظار کر رہی ہو گی۔ قرآن مجید کی ایک سورہ ہے جس کا نام ہے النازعٰت اور تم اس سورۃ کو مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ اس سورۃ کی پہلی آیت ہے والنزعٰت غرقاً اس آیت کا ترجمہ: ''آسان قرآن'' کے مؤلف جناب سید شبیر احمد صاحب نے اس طرح کیا ہے۔ قسم ہے ان فرشتوں کی جو کھینچنے والے ہیں روح کو ڈوب

کراور قرآن مجید کے دوسرے تراجم بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہونگے۔لیکن علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویزؒ کی نظر عربی ادب پر گہری تھی۔ وہ عربوں کا طرز گفتگو جانتے تھے۔مولانا حالی مرحوم نے حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں کے حالات بیان کرتے ہوئے مسدس حالی میں لکھا ہے ۔

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی

یعنی حضور ﷺ کی بعثت کے وقت عرب قوم جنگ وجدل کی وجہ سے معاشرتی طور پر پست ترین درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور یہاں سمندر کا تلازمہ باندھے ہوئے بات ہورہی ہے کہ عرب قوم جہالت، افلاس، ناخواندگی، وحشت و بربریت اور اخلاقی درندگی کے سمندر میں غرق تھی۔ناز عٰت کے بنیادی معنی ہیں کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو بالوں سے پکڑ کر باہر نکالنا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ آیت کے دولفظوں میں معنویت کی کتنی دنیائیں لپٹی ہوئی ہیں۔ہم تصور کرتے ہیں کہ ایک شخص یا ایک معاشرہ جہالت، افلاس، بے کاری اور بدحالی کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے، نہ وہ کسی کی بات سن سکتا ہے، نہ کچھ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اپنی حالت بتانے کے قابل ہے۔اس کے بال پکڑ کر اسے سمندر سے باہر نکالا جاتا ہے، وہ بیہوش ہے اور اپنے آپ سے بھی آگاہ نہیں۔ہم دنیا بھر کے مسلمانوں کی یہی حالت ہے جو مذکورہ آیت میں بیان کی گئی ہے۔علامہ اقبالؒ اس کے قریب جاتے ہیں۔اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ آنکھیں کھولتا ہے اور پوچھتا ہے میں کون ہوں، کہاں ہوں، علامہ اسے ایک شفیق مددگار کی طرح کہتے ہیں ۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ہمارے تبلیغی جماعت کے اصحاب پنجاب، سندھ، بلوچستان اور پختونخوا کے دورافتادہ دیہات میں جاتے ہیں۔وہ آکر بتاتے ہیں کہ چاروں صوبوں میں کچھ علاقے ایسے ہیں جن کے باسی اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہیں لیکن نہ تو انہیں کلمہ طیبہ سے واقفیت ہے اور نہ ہی وہ نماز پڑھنا جانتے ہیں، اور نہ ہی غلامی اور آزادی کے تصور سے آشنا ہیں۔اسی قسم کے معاشرے کے لئے کہا گیا ہے "والنازعٰت غرقاً"، اور اسی کو افلاس اور جہالت کی غرقابی میں سے سَر کے بال پکڑ کر نکالنا ہے۔اگر شہری علاقہ کے باشندوں کو دیکھیں تو وہ بھی مذکورہ بالا طبقہ سے کچھ مختلف نہیں کیونکہ کلمہ پڑھنے اور نماز، روزہ قربانی اور حج وزکواۃ کی پابندی کے باوجود دین اسلام کی حقیقت اور مقصد سے بے خبر ہیں۔علامہ اقبالؒ ہوں یا غلام احمد پرویز یا ان کے ہم خیال دانشور وہ سب اسی طبقہ کو جہالت کے سمندر سے کھینچ کر بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔اقبال ان سے کہتے ہیں کہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے اور اس کام کو کرنے والوں کو کہتے ہیں ۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

اس پر عمل کرتے ہوئے علامہ اقبال نے جوانی میں پہلوانی کی تھی۔تشکیل پاکستان کے وقت تک تو گورنمنٹ کالج لاہور کی گیلری میں ریسلنگ ٹیم کی گروپ فوٹو گراف میں انہیں پہلوان کے روپ میں دیکھا جاسکتا تھا اور جب پیکر خاکی مضبوط ہو

جائے تو کہتے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

عالم آرا: ابو! کمال کر دیا آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں تو علامہ اقبال کو دوسرے شعراء کی طرح ایک شاعر سمجھتی تھی۔

کلیم الزماں: بیٹی سنتی جاؤ ابھی تو حالت یہ ہوگی کی افسانہ از افسانہ می خیزد۔ فی الحال تم مجھے چائے کی گرما گرم پیالی دے دو۔ چائے آئی، کلیم الزماں اور عالم آرا نے گھونٹ گھونٹ مزے لے کر چائے پی، تھوڑی دیر تک تو خاموشی رہی۔ پھر عالم آرا نے کلیم صاحب سے کہا۔

عالم آرا: ابو! بات علامہ اقبال کے متعلق ہو رہی تھی۔ کچھ بتایئے ان کے متعلق اور ان کی تعلیمات کے متعلق کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔

کلیم الزماں: علامہ نے قوم کو مخاطب کر کے دو شعر ایسے کہے ہیں کہ میں جب انہیں پڑھتا ہوں تو مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ہیں۔

بہ سواد دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من

ہمہ خاوراں خوابے کہ نہاں ز چشم انجم بہ سرود زندگانی سحر آفریدہ ام من

بیٹی! یہی نہیں کہ انہوں نے نظری طور پر ہی قوم کی راہنمائی کرنے تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہو۔ بلکہ عملی طور پر اپنے خیالات اور فلسفہ کی تنفیذ کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ اس مجوزہ یونیورسٹی کا ابھی بلو پرنٹ ہی تیار ہو رہا تھا کہ علامہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور یونیورسٹی کے در و دیوار پر ''پٹھان کوٹیئے'' قابض ہو گئے۔ ''اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ''(11:114) کے جذبہ کے تحت میں وہی کام چھوٹے سے پیمانے پر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی ایک کوٹھی اس کے لئے مختص کر دی ہے اور مقامی یتیم خانے کے بچوں میں سے تیس چالیس بچے اپنی تحویل میں لینے کے لئے یتیم خانہ کی انتظامیہ سے گزارش کی ہے اس کے ساتھ میں ان بچوں کی تمام تعلیمی اور طبعی ضرورت کا ذمہ دار اور کفیل ہونگا۔ ابھی معاملہ ابتدائی مراحل میں ہے۔ جب تمام امور طے پا جائیں تو درسگاہ کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ عقیل الزماں صاحب کے پاس تو شاید زیادہ وقت نہ ہو کہ درسگاہ کی دیکھ بھال کر سکیں یہ کام تمہیں ہی اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا، یہاں تو بات سے بات نکلتی ہے تمہیں ایک تاریخی واقعہ سناتا ہوں۔ برطانیہ کے بادشاہ چارلس اول کا نام تو سنا ہوگا۔ بڑا جابر اور ظالم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے بادشاہت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے اس سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جا سکتی اسی زمانہ میں ایک سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا جو معاشرے میں بڑا مقبول تھا۔ ایک دن کنگ چارلس لندن کی گلیوں میں گشت کرتے کرتے مذکورہ ہیڈ ماسٹر کے سکول جا پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر کو اپنے دفتر میں موجود نہ پا کر چارلس نے کلاسوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک کلاس

میں پڑھا رہے تھے۔ چارلس ان کی کلاس میں جا بیٹھا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے بادشاہ سلامت کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ کی۔ ہیڈ ماسٹر کا رویہ کچھ یہ تھا کہ انہیں پروا نہیں تھی کہ گاؤ آمد و خرفت۔ تھوڑی دیر کلاس میں رہنے کے بعد چارلس ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں جا بیٹھا اور جب کلاس ختم کر کے ہیڈ ماسٹر اپنے دفتر پہنچا تو بادشاہ سلامت کو دیکھ کر اس نے ایک ایسی بات کہی جو تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بادشاہ سلامت سے کہا

Your majesty it was not due to disrespect that I did not pay any heed to you, but the fact is I do not want my children to know that there is any body bigger than me in London. Only then I can teach them.

روایت ہے کہ بادشاہ ہیڈ ماسٹر کی بات سن کر مسکراتے ہوئے دفتر سے باہر نکل گیا۔

بیٹی عالم آرا: میں چاہتا ہوں کہ جو درسگاہ میرے تصور میں آ رہی ہے اس میں استادوں کا مقام ایسا ہی بلند ہو۔ معلوم نہیں برطانیہ کے حالات آج کل کیسے ہیں۔ سنا ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ اگر دکاندار کو معلوم ہو جاتا کہ گاہک ایک استاد ہے تو وہ احتراماً کرسی سے اٹھ کر اس سے بات کرتا تھا۔ کبھی ہمارے ہاں بھی یہ روایت تھی۔ پروفیسر گوہر علی شاہ مرحوم کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ایک دفعہ ایک دوست کے ساتھ اپنے وقت کے مشہور رومانی شاعر اختر شیرانی سے ملنے گئے۔ اختر شیرانی بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ شراب بہت پیتے تھے۔ دوست کو دیکھتے ہی تکیے کے نیچے سے بوتل نکالی اور ایک گھونٹ پی کر دوست کا استقبال کیا اور تعارف پر جب اسے معلوم ہوا کہ دوسرا شخص جغرافیہ دان ایک پروفیسر ہے جو اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھاتا ہے تو اختر شیرانی بستر سے کود کر کھڑا ہو گیا اور گوہر علی شاہ سے کہا کہ مجھے معاف کر دیجئے میں نہیں جانتا تھا کہ آپ استاد ہیں۔ یہ لوگ میری نسل کے استاد اور شاگرد تھے۔ میں کچھ مزید تبصرہ کرنا نہیں چاہتا تمہیں یہ کہانیاں اسلئے سنا رہا ہوں کہ ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں آں قصۂ پارینہ را

آمدم برسر مطلب میری مجوزہ درسگاہ ملک کے دوسرے سکولوں سے مختلف ہوگی۔ جہاں تعلیم کے نام پر صرف معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ جہاں لیلیٰ مجنوں کے قصے سنائے جاتے ہیں۔ شیریں فرہاد، بیستوں اور تیشہ فرہاد کی بات کی جاتی ہے۔ بیٹی اب وہ پرانے قصوں کا زمانہ گزر گیا ہے۔

جوئے شیر و بیستوں افسانۂ دیرینہ است جوئے خوں آوردن و جان کندن ایجادِ من است

یہ مولانا گرامی کا شعر ہے۔ مجھے اب اسی پر عمل کرنا ہوگا۔ موجودہ زمانہ جان کنی کا زمانہ ہے بے تحاشا محنت کی ضرورت ہوگی۔

عالم آرا: ابو! یہ چھوٹی سی درسگاہ کیا کیا کام کرے گی۔ یہ میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لوں۔

کلیم الزماں: بیٹی! میں نے ساری عمر وکالت بھی کی ہے اور عدالت کی کرسی پر بھی بیٹھا ہوں۔ اسلئے حقیقت پسندی میری رگ رگ میں موجود ہے۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ ہماری درسگاہ صرف دہی میں جاگ کا کام کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری درسگاہ سے فیضیاب ہونے والے بچے بڑے ہو کر اپنے زمانے کے سرسید بن جائیں اور علمائے اخلاق اور علمائے شعر و ادب کے ساتھ ماہرین علم و فن بھی پیدا ہوں اور ان سے بھی اہم بلکہ اہم ترین وہ علوم ہیں جن کا جاننا کرہ ارض پر انسانی

زندگی کے لئے ضروری اور لابنیفک ہے۔

عالم آرا: ابو! میں روزانہ اخبار بینی کر لیتی ہوں اور ملک کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہوں۔ آپ کے ذہن میں جو بات کلبلا رہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ عمران خان، ابرار الحق، پروفیسر عطاالرحمن، پروفیسر جاوید لغاری اور شہزاد رائے قسم کے درد دل رکھنے والے معلموں کی ایک کھیپ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اپنی قبروں کے لئے سویٹزرلینڈ یا دوبئی میں زمین خرید رکھی ہے وہ آپ کو اپنی کوششوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

کلیم الزماں: بیٹی! میں اسی درسگاہ میں ایسے نوجوان بھی پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جن کے اندر گولکنڈہ کے سربراہ محمود گواں کی روح رقص کر رہی ہوگی۔ میرا خیال ہے اور ممکن ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں لیکن میرا خیال یہی ہے کہ طبعی علم کے بغیر شعروادب میں نہ تو مطالب کی گہرائی پیدا ہوسکتی ہے۔ اور نہ وسعتِ ادراک، بلکہ اپنے ماحول سے واقفیت نہ ہو تو انسان معنوی طور پر گونگا اندھا اور بہرہ رہتا ہے۔

عالم آرا: آپ کی بات میرے سر کے اوپر سے گزر گئی ہے بہرحال آپ کی سکیم بڑی عمدہ ہے اور جہاں آرا بہن بھی ہماری مدد کرسکتی ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی! یہ کام میں نے اور تم نے مل کر کرنا ہے۔ عقیل صاحب بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور شکیل صاحب! اپنی کرکٹ سے اکتا گئے تو ان سے بھی امید رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن جہاں آرا کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کے سسرالی ڈھول ڈھمکے والے ہیں۔ مزاروں پر حاضری دینا، عرسوں میں شریک ہونا، جلوس نکالنا یا ان میں شرکت کرنا اور میلاد کی محفلیں گرم کرنا، ان کے ہاں یہی مقصد حیات ہے اور جہاں آرا کو ان کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ میں بھی کچھ نہیں کہتا کیونکہ نازک رشتہ ہے اور پھر میں تو میر انیس کی نصیحت پر عمل کرنے کا قائل ہوں جنہوں نے فرمایا تھا:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہردم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اپنی آئندہ نشست میں اس پر گفتگو ہوگی کہ علامہ اقبال نے جس معاشرے کو جہالت اور افلاس کی غرقابی سے نکالنا چاہا ہے اسے کیا کرنا ہوگا، کیونکر کرنا ہوگا۔ اتنا جانتا ہوں کہ علامہ اقبال ہمارے روشن مستقبل کے متعلق یہ پیش گوئی کر گئے ہیں کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

میں تھک گیا ہوں اب تم بھی تھک گئی ہوگی، اب آرام کرو۔

عالم آرا: ابو مجھے یہ سمجھاتے جایئے کہ شعروادب کا ماحول سے کیا رشتہ ہے۔ شعر تو دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔

کلیم الزماں: میں اس وقت لمبی بحث کے موڈ میں نہیں۔ صرف ایک بات کہتا ہوں کہ کیا برفانی علاقہ میں رہنے والا ایک ایسکیمو یہ شعر کہہ سکتا ہے یا سمجھ سکتا ہے۔ سوچتی رہو رات بھر۔

چار تنکوں کی سلیقے سے اگر ترتیب ہو بجلیوں کو بھی طوافِ آشیاں کرنا پڑے

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 33)

آخری باب

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

قرآن میں دی گئی اقدارِ خداوندی کا اسلام کے مکمل و مثالی نظام میں نفاذ

دنیا میں جو قوم اپنے اختیارات کو قرآن کی حدود و قیود کے ماتحت استعمال کرتی ہے وہ اسلامی مملکت کی علمبردار کہلاتی ہے۔ جو جماعت اپنے اختیارات کو ان حدود و قیود کے مطابق استعمال نہیں کرتی بلکہ اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت صَرف کرتی ہے وہ غیر اسلامی کہلاتی ہے۔ اسلامی دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک الگ قرآنی معاشرہ کے قیام کے لئے مطالبۂ پاکستان میں ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا گیا تھا، جس معاشرہ کے آئیڈیل نظام کی جھلک ہمارے رسول اور اُس کے رُفقائے کار کے خلافت کے دور میں دیکھی گئی۔ یہ نظام قرآن کی ہی مستقل۔ غیر متبدل اور مُطلق اِقدار کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، جنہیں آج کے دور میں بنیادی حقوقِ انسانیت کا اقوام متحدہ کی طرف سے نام دیا جاتا ہے۔ ہمارے دور میں دیکھا گیا ہے کہ حقوقِ انسانیت مرتب کرنے کی ذمہ داری عالمی تنظیم اقوام متحدہ نے لی ہوئی ہے اور اِس میں دنیا کے تمام حکماء کی کاوشیں شامل ہیں۔ لہٰذا مناسب سمجھا گیا ہے کہ مفکرین کی علیحدہ علیحدہ آرا کو زیر بحث لانے کی بجائے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے پہلے اقوام متحدہ کے مرتب کردہ بنیادی حقوقِ انسانیت کے چارٹر کی فہرست کی طرف نظر دوڑائی جائے۔ اِنہیں فطری مُطلق حقوق بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ حقوق یا استحقاق جو انسان، انسان ہونے کے ناطے سے خلقی اور پیدائشی طور پر رکھتا ہے۔

اقوام عالم کے بنیادی حقوقِ انسانیت کی فہرست:

اقوامِ متحدہ کے بنیادی حقوقِ انسانیت کے چارٹر میں اعلان کیا گیا ہے کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور یکساں حقوق کے حصول میں سبھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ حقوق نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب سیاسی یا دیگر خیالات، قومی یا معاشرتی، وطن، جائیداد، پیدائش یا کسی منصب کی تمیز و تفریق کے بغیر سب کے لیے یکساں طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اِن کی دنیا میں رہنے والے ہر فرد کو مُطلق و مکمل ضمانت و حفاظت کی لازمی ادائیگی کی جاتی ہے، جن میں اہم حقوق کی شِقوں کو سامنے لایا جا رہا ہے۔

شق 1: تمام انسان پیدائشی طور پر مساوی ہیں اور باہم بھائی چارے کے متقاضی ہیں۔

شق 2: اس اعلامیے میں دیئے گئے تمام حقوق اور آزادیوں کا اطلاق ہر شخص پر بلا امتیاز رنگ و نسل، جنس و زبان، مذہب اور سیاسی خیالات ہوگا۔

شق 3: ہر شخص کو حقِ زندگی اور اپنی شخصی آزادی اور تحفظ کا حق ہے۔

شق 4: غلامی اور بیگار پر پابندی۔

شق 5: ہر فرد کا تشدد، تضحیک و تذلیل اور غیر انسانی سلوک سے تحفظ۔

شق 6: ہر انسان کو ہر جگہ اپنی حیثیت منوانے کا حق۔

شق 7: قانون کی نظر میں ہر فرد ہر اعتبار سے مساوی ہے۔

شق 8: بنیادی حقوق کی خلاف ورزی پر قانونی چارہ جوئی کا حق۔

شق 9: استبدادی گرفتاری (غائب کر دینا)، نظر بندی اور ملک بدری پر پابندی۔

شق 10: کھلی عدالت میں کسی جرم، الزام اور فیصلے کے خلاف شفاف اور منصفانہ سماعت کا حق۔

شق 11: کھلی عدالت میں جرم ثابت نہ ہونے تک بے گناہ ہونے کا تصور۔

شق 12: کسی شخص کی نجی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں عدم مداخلت اور عزت و تکریم پر حملے کی ممانعت۔

شق 13: ہر جگہ سکونت اختیار کرنے کا حق، دوسرے ملک میں پناہ حاصل کرنے اور واپسی کا حق۔

شق 14: عقیدے کی بنیاد پر ایذا رسانی اور زیادتی سے تحفظ اور بیرونِ ملک پناہ حاصل کرنے کا حق۔

شق 15: ہر شخص کو قومیت کا حق۔

شق 16: بلا قیود و حدود شادی کرنے اور خاندان بسانے کا حق۔ تنسیخِ نکاح کا مرد و زن کو مساوی حق۔ شادی میں فریقین کیلئے رضامندی اور آزادی کا حق۔

شق 17: تنہا یا مل کر جائیداد بنانے کا حق۔ جائیداد سے محرومی سے تحفظ۔

شق 18: ہر انسان کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا پورا حق، جس میں مذہبی آزادی، تبدیلیٔ مذہب اور اپنے مذہب کی تبلیغ و پیروی کا حق۔

شق 19: حقِ اظہار اور بلا مداخلت رائے قائم کرنے، معلومات حاصل کرنے اور اُنکی ترسیل و اشاعت اور نشر کر سکنے بشمول میڈیا کی آزادی۔

شق 20: پُرامن اجتماع، تنظیم سازی، جلسے جلوس کی آزادی۔

شق 21: حکومتی امور میں ہر شخص کی براہِ راست، آزادانہ طور پر منتخب کئے گئے نمائندے کے ذریعہ شرکت کا حق۔

شق 22: حکومتی و ریاستی اتھارٹی عوام کی منشا کی بنیاد پر استوار ہوگی۔

شق 23: ہر شخص کو معاشرتی تحفظ ہو جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کیلئے لازم ہے۔

شق 24: روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی معقول شرائط اور بے روزگاری سے تحفظ۔ معقول مشاہرے کا حق اور سوشل سیکورٹی۔

شق 25: آرام و فرصت کا حق، تنخواہ کیساتھ تعطیلات کا حق۔

شق 26: مناسب معیارِ زندگی کا حق، بشمول خوراک، لباس، رہائش، علاج، تعلیم اور بیروزگاری، بیماری، بیوگی، بڑھاپے اور معذوری سے تحفظ کا حق۔ زچہ بچہ کے حقوق کا احترام و عملدرآمد۔

شق 27: ہر شخص کو تعلیم کا حق۔ ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہو جو رواداری، باہمی مفاہمت، دوستی اور امن و آشتی کو فروغ دے۔

شق 28: ثقافتی زندگی، فنونِ لطیفہ اور سائنس کی ترقی سے مستفید ہونے کا حق۔

شق 29: تصنیف و تحقیق سے اخلاقی و مالی فائدہ حاصل کرنے کا حق۔

شق 30: ایسا معاشرتی و بین الاقوامی نظام جس میں ہر شخص وہ آزادیاں اور حقوق حاصل کر سکے جو اس اعلامیہ میں شامل ہیں۔

شق 31: معاشرتی حقوق پر عملدرآمد، دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کا احترام۔

اعلامئے میں بیان کردہ کسی بات سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا جس سے مذکورہ حقوق و آزادیوں کی نفی ہوتی ہو۔

ہم سب کے علم میں ہے کہ انسان جس بات کی ضمانت چاہتا ہے اور جس ضمانت سے اسے حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے کچھ حقوق مطلق ہونے کی بناء پر ایسے ہیں جو اسے محض انسان ہونے کی حیثیت سے بلا مشروط حاصل ہیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ یہ ہمیں رسول ﷺ کے دور میں حاصل تھے۔ اِن حقوق میں نہ کوئی ردوبدل اور نہ ہی من مانی حدود و قیود عائد کر سکتا تھا۔ اِن اقوامِ متحدہ کے بنیادی حقوقِ انسانیت کو یہاں جب ایک طرف، انسان کے ہاتھ میں حقوق کی فہرست دے دی جائے اور دوسری طرف اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ ارباب اقتدار کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ از روئے عدل ان حقوق پر پابندیاں عائد کر دے، تو اس قسم کے حقوق سے کیا حاصل ہوگا؟ وہ ارباب اقتدار کی دخل اندازی سے بچنے کے لیے ہی تو حقوق چاہتا تھا۔ اقوام متحدہ نے ان مشروط حقوق انسانیت کی مشروط فہرست پر قوموں کی طرف سے عمل درآمد کی ضمانت کے حصول کے سوال پر بھی لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں، حقوق انسانیت کا احترام کرے گی۔ گزشتہ دنوں، اقلیتوں پر جس قدر مظالم کیے گئے ہیں اس سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ اس ضمن میں دائمی اور حتمی طور پر اِن بنیادی حقوق کی بِلاتعطل فراہمی کے سلسلہ میں قرآن کی روشنی میں یہ تجویز بھی دی جاتی ہے کہ:

سب سے پہلے یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے تو ہی ان کے استعمال پر متفق ہوا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حقوق انسانیت کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور بھی مشترک ہو۔ جسے اسکا نظریہ حیات کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حقوق کی فہرست مرتب کر دینے سے حقوق کی نگہداشت نہیں ہو جایا کرتی۔ جب تک نظام سیاست میں حاکم اور محکوم کا تصور موجود ہے، اس وقت تک انسانی حقوق کے تحفظ کا سلسلہ لاینحل رہے گا۔ تحفظ حقوق کے لیے انسان کا انسان پر حکومت کے تصور کو مٹا کر قوانین کی حکومت کا تصور ضروری ہے۔

حقوق انسانیت کے احترام کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک زندگانی کا عملی تصور مشترک ہو اور جب تک ایسا نہیں ہوگا تحفظِ حقوق انسانیت کی کوئی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اگر اقوام متحدہ کے ارباب اختیار فی الواقعہ چاہتے ہیں کہ ان حقوق کا احترام ہو تو اسے چاہیے کہ یہ حقوق انسانیت پر عملدرآمد کرانے کے سبھی ممبر ممالک سے مشترکہ مفاد ہونے کے سبب باقاعدہ ایک علیحدہ معاہدہ کر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے اور اِس تمام نوعِ انسانی کو ان کا پابند کیا جائے۔ حکمائے مغرب کے نظریات کے حوالے سے ہم نے ان کی متفقہ کوششوں سے مرتب کیے ہوئے اقوام متحدہ کے حقوق انسانیت کے چارٹر کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے مقابل میں اس باب میں قرآن نے قرآنی معاشرہ کے لیے اجتماعی مستقل اور غیر متبدل اقدار کی طرف رہنمائی کی ہے۔ سیاست کی زبان میں ان کو بنیادی حقوق انسانیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

قرآنی بنیادی حقوقِ انسانیت کی اہمیت:

قرآن کریم تمام نوع انسان کے لیے حقوق (اقدار) کے یکساں پیمانے مقرر کرتا ہے۔ وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷

(10:57)

''اے نوع انسان! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ضابطہ حیات آ گیا ہے۔ اور شفاء دلوں کے روگ کی اور ہدایت اور رحمت مومنین کے لیے۔''

یعنی اس ضابطہ ہدایت میں ہر اس نفسیاتی کشمکش کا علاج ہے جو انسانوں کے دلوں کو وقف اضطراب رکھتی ہے اور اس طرح ان کے معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ جو لوگ اس ضابطہ کو صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ان پر کامیابیوں اور خوشگواریوں کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

اس ایمان کی بنیاد اس علیٰ وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون مکافات عمل کی رو سے متعین ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اقوام کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قومیں حقوق انسانیت کا احترام اور

تحفظ نہیں کرتیں وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور اِن کا عسکری ساز و سامان (روس کی مثال ہمارے سامنے ہے) انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو نہ کسی کی خاطر بدلا ہے نہ بدلے گا۔ یہی وہ نظریہ زندگی (مستقل اقدار پر مبنی معاشرہ کا قیام) ہے جس سے حقوق انسانیت (پوری نوع انسانی کا) تحفظ ہو سکتا ہے۔

یہاں قرآن نے وضاحت سے بتا دیا ہے کہ حقوق انسانیت کی جو فہرست قرآن کی طرف سے دی گئی ہے وہ ان فہرستوں سے بہتر (خیر) ہیں جو حکمائے مغرب یا اقوام متحدہ نے اپنے عقل سے مرتب کی ہیں۔

ہمارے مطالعہ میں ہے کہ اِسلامی نظام کو ایک معاہدہ کی شکل میں دینُ الاسلام کے اصولوں پر مبنی معاشرہ قائم کر کے سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا۔ یہ دینِ الاسلام رسول اللہ ﷺ کی زندگی تک نہیں رہنا تھا، اسے آپ ﷺ کے بعد بھی بطورِ معیارِ مُطلق آگے چلنا تھا۔ اِسی نظام کے تصور کی نظریہ پاکستان کے مقاصد کی شکل میں وضاحت و تائید قائداعظم کے اُس جواب سے ہو جاتی ہے، جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن کے طلباء کے سوال پر دیا۔ اسے روزنامہ انقلاب (مدیران غلام رسول مہر و عبدالمجید سالک) لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 8 جنوری 1942ء میں جگہ دی۔

جب اُن یہ سوال کیا گیا کہ دوقومی نظریۂ پاکستان کی رو سے، کیا اسلامی مملکت کا قیام ہی اصل مقصد اور نصب العین ہے، یا یہ ذریعہ ہے کسی مقصد اور نصب العین کے حصول کا؟

اِس کے جواب میں خود قائداعظم نے حکومتِ پاکستان کے آفیسرز کو مخاطب کرتے ہوئے 1947ء میں بھی فرمایا کہ:

''ہماری اپنی مملکت (پاکستان) کی تخلیق ایک ذریعہ تھا مقصد کے حصول کا، نہ کہ خود ایک ذریعہ۔ اِس کا مقصد ایک ایسی مملکت کا حصول تھا، جس میں ہماری ذات کی نشوونما خود ہمارے اسلامی تمدن اور عقائد کے مطابق ہونی چاہیے۔ اِسی تناظر میں قائدِ اعظم نے اِسی دینِ الاسلام کے قیام کے تسلسل میں دوقومی قرآنی نظریہ پر مملکتِ اسلامیہ پاکستان کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اِس مطالبہ کے نتیجہ میں لوگوں نے اپنا حقِ رائے دہندگی تقسیمِ پاکستان کے حق میں ووٹ ڈال کر اپنی رضامندی کا اظہار مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے قیام کے موقعہ پر ہی دے دی۔''

پاکستان میں اسلامی/قرآنی نظام کا بتدریج عملی نفاذ:

قرآن سے راہنمائی ملتی ہے کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (25:32)

اور کافروں نے اعتراض کیا کہ اس رسول ﷺ پر سارے کا سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ (تاکہ ہمیں معلوم ہو جاتا کہ ہم سے کیا کیا باتیں منوائی جائیں گی)۔ اے رسول! ہم نے اس قرآن کو بتدریج اس لئے نازل کیا کہ

اس پر ساتھ کے ساتھ عمل ہوتا چلا جائے اور عمل کے خوشگوار نتائج تمہاری تقویّت اور ثبات قلب کا موجب بنتے چلے جائیں۔ اس کی تعلیم باہم دگر مربوط ہے۔ قرآن اِس آیت میں وضاحت کر رہا ہے کہ جو پروگرام ہم دے رہے ہیں، اس نے بتدریج ہی قائم ہونا ہے۔ تعمیری کام بتدریج تکمیل تک پہنچتے ہیں، جبکہ فساد یا تخریب کو تو بہت جلد برپا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا پروگرام ایک انقلابی اور تعمیری پروگرام ہے، جس سے قلب و نظر میں تبدیلیاں آجائیں گی۔ ہر قدم پر ایک پروگرام آئے گا، اسے سمجھایا جائے گا، لوگوں کو پروگرام پر آمادہ کیا جائے گا، پھر اس پر عمل کیا جائے گا۔ قرآن کے ایک پروگرام سے دوسری کڑی خود بخود نکلتی چلی جائے گی۔ جب دوسری کڑی نکلے گی تو اس دوسری کڑی کے لئے راہ نمائی نازل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کو بتدریج نازل کیا گیا ہے۔ موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کو ترتیل یا ترتیل کہا جاتا ہے۔ موتی یکلخت نہیں پروئے جاتے، ایک ایک موتی کو بتدریج پرویا جاتا ہے، تب کہیں جا کر لڑی یا مربوط ہار بنتا ہے۔ جب قرآن کے نازل شدہ حصے پر عمل ہو جائے گا، تو پھر اس میں سے اگلی کڑی یا بات نکلے گی، پھر اس اگلی بات یا کڑی کے متعلق سمجھایا جائے گا، اور پھر عمل کرایا جائے گا۔ عمل کرنے کے نتیجے میں اگلی کڑی پھر نکلے گی۔ اس کے متعلق سمجھایا جائے گا اور عمل کرایا جائے گا۔ ہمارا پروگرام کڑی در کڑی چلتا ہوا تکمیل تک پہنچے گا۔ کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا یہ بڑا ہی سائنٹفک طریقہ ہے۔ سائنسدان کے سامنے ایک فارمولا ہوتا ہے، جس پر آہستہ آہستہ عمل کرتے ہوئے، وہ آخر تک پہنچتا ہے۔ یہ جو تدریجی انداز ہے، اس میں کسی ایک درجے یا قدم Step سے اگلا قدم خود بخود نکلتا ہے۔ اسے قرآن کی رو سے ترتیل کہتے ہیں۔

اسی بات کو زراعت کی مثال سے سمجھتے ہیں۔ زمین میں مناسب گہرائی پر بیج کو دفن کرنے اور پانی دینے سے، سب سے پہلے بیج کی تخریب ہوتی ہے، تو اس میں سے پودے کی جڑیں زمین میں پیوست ہو کر زمین کے نمکیات کو اپنے میں جذب کرتی ہیں۔ پھر جڑوں کے بعد پودے کی کونپل نکلتی ہے، پھر تنا بنتا ہے، پھر تنے میں سے شاخیں پھوٹتی ہیں، پھر پودے میں پھول آتے ہیں اور پھول سے پھل بنتا ہے۔ آپ نے دیکھا پودا یکبارگی پھل نہیں دینے لگتا۔ وہ بتدریج پھل دینے کی حالت تک پہنچتا ہے۔ ہر پچھلی کڑی، جب تکمیل کو پہنچتی ہے، تو اگلی کڑی سامنے آتی ہے۔ جب کوئی چیز آہستہ آہستہ، کڑی در کڑی، منزل بہ منزل تکمیل کو پہنچتی ہے تو اسے ترتیل کہا جاتا ہے۔ اِس سے ہمیں سمجھ آ گیا کہ خدا نے قرآن کریم کو کیوں بتدریج نازل کیا۔ اس لئے کہ کائنات میں، طبیعی امور ہوں یا اخلاقی امور، وہ درجہ بدرجہ، آہستہ آہستہ ہی تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی ہر راہ نمائی، پچھلی کڑی سے مربوط ہے۔ اس ضمن میں ہمیں رسول اکرم کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنی ہوگی، جنہوں نے تمام مدارج کو بتدریج طے کرتے ہوئے مثالی نظام کے نفاذ کو مکمل کیا۔ لہٰذا ابھی مُلک کے دستور میں اللہ کی حاکمیت کا اعلان کر کے سرخروتو ہوا جا سکتا ہے لیکن نفاذ یکدم نہیں، بلکہ بتدریج ہونا ہی ممکن العمل ہے۔ تردد کرنے کی بات نہیں بلکہ یہی اللہ کا اصول ہے، جس میں نہ تبدیلی ممکن ہے اور نہ ہی کوئی استثناء ہے۔

قرآن کریم کے مکمل اور آخری مرحلے کے احکام، جس میں خصوصی طور پر معاشی نظام میں ربٰو کی ممانعت کا حکم بھی شامل ہے وہ غیر تربیت یافتہ معاشرے میں نافذ نہیں کئے جاسکتے۔ جو لوگ ہمارے آج کے ماحول میں، ہمارے لئے قرآنی احکام پر مبنی معاشرے کا غیر منطقی انداز میں انطباق کرنے کا کہتے ہیں، وہ قرآن کے تدریجی عمل کی تکذیب کرتے ہوئے حقیقت سے دور ہوتے ہیں۔ قرآن کے قانونِ بتدریج ارتقاء کے مطابق ہر منزل کے ترتیب وار پروگرام کو طے کرتے ہوئے ہی ہم اگلی منازل میں قدم رکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں ہمیں رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں تمام مدارج کو بتدریج ہی طے کرنا ہوں گے۔ ابھی مُلک کے دستور میں اللہ کی حاکمیت کا اعلان کر کے سرخرو تو ہوا جا سکتا ہے لیکن نفاذ یکدم نہیں، بلکہ بتدریج ہونا ہی ممکن العمل ہے۔ بتدریج نفاذ کا اصولِ خداوندی ہمارے لئے تردد کا باعث نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ ہی کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، جس میں نہ تبدیلی ممکن ہے اور نہ ہی کوئی استثناء ہے۔ اسلامی مملکت کے قیام سے قبل جماعتِ مومنین کی ایک بڑی جماعت میں اِن سبھی بتدریج مراحل سے گُزر کر تشکیل پا کر تیار ہو کر اسلامی حکومت کے قیام اعلان کرنے کی پوزیشن میں آ گئی ہو تو اعلان کے ساتھ ہی اِسلامی نظام کے مکمل نظام کے نفاذ کے قیام کا اعلان کر سکتی ہے۔

پاکستان میں مکمل اسلامی نظام کے قیام کا اعلان:

اِسلامی نظام کے مکمل نظام کے نفاذ کا قیام درج ذیل اقدامات کے ذریعے سے ممکن العمل ہوسکتا ہے۔

1۔ دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ہماری ایک آزاد مملکتِ اسلامیہ پاکستان معرض وجود میں آئی ہے، وہ اب اس امر کا اعلان کر دے کہ:

(ا) اس کا تمام کاروبارِ مملکت قرآن کے غیر مُتبدل اصولوں کے مطابق ہوگا۔

2۔ ایک زندہ اتھارٹی (مومنِ حقاً کی صفات کی حامل) مشاورت سے انتخاب شُدہ موجود ہوگی جو قرآن کے غیر مُتبدل اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے قوانین و احکام مرتب کر کے اُن کا نفاذ کرنے کی پابند ہوگی، اور ہم سب اُن کی اطاعت کرنے کے پابند ہوں گے۔

3۔ ہمارے علم میں ہے کہ قرآن مجید بڑی واضح اور مبین کتاب ہے اور اِس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ غور فکر کے ساتھ اس کے احکام و قوانین، اصول و اقدار کو سمجھنے میں دشواری نہیں بلکہ آسانی میسر ہے۔ قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین متعین شکل میں دئے گئے ہیں، لیکن اکثر اقدار، اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ یہ سب غیر متبدل اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

4۔ جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے اربابِ فکر و نظر، نمائندگانِ ملت، ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان کے جزئی قوانین مرتب کریں گے۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آ رہا ہے، ان میں جو قوانین قرآنی

اصولوں کے مطابق اور ہمارے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، انہیں ایسے ہی رہنے دیا جائے گا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں تبدیلی کرلی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنایا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین، زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ مشاورت سے بدلتے جائیں گے۔

5۔ اِس مجلسِ مشاورت کو آپ پارلیمان کہہ لیجئے، جو ایک ہی حزبُ اللہ پارٹی پر مشتمل ہوگی، جس کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط پاکیزہ زندگی اور قرآنی احکام واقدار سے واقفیت ووابستگی ہوگی۔

6۔ اگر کبھی یہ سوال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کررہی ہے وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں تو فیصلہ ہمیں عدالتِ عالیہ کے ہی سپرد کرنا ہوگا کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ ضرورت محسوس کرے تو ایسے اربابِ علم ودانش سے مشورہ بھی کرے جن کی قرآن پر گہری نظر رکھنے کی سند ہو۔ اس کے بعد عدالتِ عالیہ کا فیصلہ قولِ فیصل تسلیم کرلیا جائے۔ یہ اعتراض کہ اس طرح بالادستی پارلیمان کی نہیں بلکہ عدالتِ عالیہ کی ہوجائے گی، بے معنی ہوگا۔ یہ ذہن میں رہے کہ قرآنی نظام میں بالادستی نہ پارلیمان کی ہوتی ہے، نہ کسی دوسرے ادارہ کی۔ اِس میں بالادستی کتاب اللہ کی ہوتی ہے۔ اِن سبھی اداروں کا منصب صِرف یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ معاملہِ زیرِنظر میں اللہ کی کِتاب کا کیا حُکم ہے۔

دستور پاکستان میں بیان کردہ نظریہ پاکستان کی توثیق:

To put in the words of Constitution under Preamble, it is stated there in where as sovereignty of the entire universe belongs to almighty Allah alone, and the authority to be exercised by the people of the Pakistan within the limits prescribed by Him is a "sacred trust"

آئین کے دیباچہ ہی میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ:

پوری کائنات میں حاکمیت اعلیٰ رب کریم کی ہے اور حکومت جو بھی ہو اُس میں پاکستان کی عوام ایک مُتبرک ٹرسٹ کے طور پر حاکمانہ اقتدار کو اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے اندر استعمال کرے گی۔

دستور میں دی گئی اس وضاحت سے نظریہِ پاکستان کا مفہوم یوں سامنے لایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود متعین کردی ہیں اور انسانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات جس طرح جی چاہے استعمال نہیں کرسکتے بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اختیارات کا استعمال ان حدود کے اندر کریں۔ لہٰذا سب سے پہلے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آئین کے دیباچہ کی توثیق کو آج کی دستوری زبان میں قرارداد کے خاکہ کی شکل میں آئین میں اِن شِقوں کے شامل کیا جائے۔

اضافے سے قرآن کی سورہ آل عمران کی روشنی میں واضح کرنے ہوں گے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ (3:18)

اللہ شہادت دیتا ہے کہ اُس کے علاوہ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں یہی لا الہ الا ہو کا اصول کائنات میں بھی کارفرما ہے، جسے سائنسدان کائنات میں وحدتِ قانون LAW OF UNIFORMITY OF NATURE کہتے ہیں۔ یہ ایک ہی قانون ہے، جو انسانی دنیا اور خارجی کائنات دونوں کے لئے خدا نے تجویز کیا ہے۔ اور ہمارے لئے یہی الہ واحد کا مفہوم کائنات میں وحدتِ قانون ہے، جو حضراتِ انبیائے کرام کی وساطت سے انسانوں کو وحی کے ذریعے سے ملتا رہا، اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ مسلمانوں کی وجہِ جامعیّت اسلام ہے اور یہی وہ دوقومی قرآنی نظریہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ اِسی کی بِنا پر مملکتِ پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ اِس مملکت کے باشندے اِس مخصوص تصورِ حیات کے مطابق جس میں اختیارِ حُکمرانی کو حدود اللہ کے اندر آزادانہ استعمال کر سکیں۔ خارجی کائنات میں جاری وساری قانون اور انسانی کائنات کے لئے قانون، جو انبیائے کرام کے ذریعے دیئے گئے، ان دونوں کی تعلیم کا ملخص لا الہ الا ہو ہے، یعنی اقتدار اور اختیار، محکومیت اور اطاعت کا حق صرف ایک اللہ کو حاصل ہے۔

کائنات میں تو الدین یا الاسلام از خود جاری وساری ہے، لیکن انسانی دنیا میں عملی طور پر الدین یا الاسلام تب بنے گا، جب انسان اپنے اختیار وارادے سے خدا کے قوانین کو اپنی زندگی میں نافذ کرے گا۔ جب کائناتی دنیا سے ہم آہنگ، انسانی دنیا کے لئے قانون، انسانی زندگی کے اندر عملی شکل اختیار کر لے گا، تو یہ الدین یعنی اسلامی نظام کہلائے گا۔ قرآن کے مطابق عمل کرنے سے، انسان کا عمل، کائناتی قانون سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس ہم آہنگی کو، الاسلام یا الدین کہا جائے گا۔ اِسی ہم آہنگی کے تناظر میں اسلامی حکومت کے مقاصد قرآن نے دیئے ہیں، جن کو قانونی رنگ دے کر دوقومی قرآنی نظریہ پاکستان کی بنیاد پر مطالبہِ پاکستان کے تحت بطور مسودّہ قراردادِ مقاصد کا عنوان دے کر قانونی زبان میں پیشِ خدمت کیا جا رہا ہے۔

1۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جسے قرآن کی الدین کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس نظامِ حیات کا بنیادی دستور وضابطہ قرآن اور اسوہ رسول ہے جو قرآن میں دیا گیا ہے۔

2۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان کو اپنے اختیارات کے استعمال کی اجازت ہے۔ یہ نصب العین اور حدود غیر متبدل ہیں اور انہی کو ابدی صداقتیں کہا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کا اختیار اِن ابدی صداقتوں کی روشنی میں، اپنے عصری تقاضوں کے مطابق جُزئیات مرتب کرنے تک محدود ہے۔

3۔ قرآن کی رو سے حیات کا سرچشمہ ایک ہے اور وہی سرچشمہ اِن ابدی بنیادی صداقتوں کا ہے جن کا ذکر درجِ ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

(ا) تمام نوعِ انسان ایک برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، نسلی، لسانی، وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی اور

(ب) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے میں مُضمر ہے۔

4۔ اسلام کا مقصود ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہے جو اپنے مخصوص نظریہ اور فلسفہِ حیات رکھتا ہے۔ وہ اُس کے مطابق، افرادِ انسانیہ کی تربیت کے ذریعے، ایک ایسی فضاء کی تخلیق کرتا ہے جس میں یہ افراد اولاً، اپنی جماعت میں اسلام کے فلسفہ کو عملاً آزماتے ہیں اور اس کے بعد اس کے فلسفہ کو تمام نوعِ انسانی تک پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ اِسلامی معاشرہ کے قیام میں افراد کا منتہٰی اِسلامی اصولوں کے بتدریج حصول سے آخر الامر ایک آئیڈیل نظام کا قیام ہوتا ہے۔ اِن شِقوں کی شمولیت کی ضرورت اس لئے محسوس کی جاتی ہے کہ دوقومی قرآنی نظریہِ پاکستان کا مطالبہ ہی قرآن کی سورہ آل عمران کی روشنی میں نظریہِ توحید کی بِنا پر کیا گیا تھا۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ (3:18) اللہ شہادت دیتا ہے کہ اُس کے علاوہ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآنی مستقل اقدار، جسے وہ حق اور خیر کا نام دیتا ہے اور غیر قرآنی اقدار یعنی انسانوں کی خود ساختہ اقدار جن کو وہ باطل اور شر کا نام دیتا ہے، کا جب کبھی بھی ٹکراؤ ہوا ہے تو قرآنی اقدار (خیر یا حق) کا ہمیشہ غلبہ ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (21:18)

''یوں نہیں بلکہ ہم پھینک مارتے ہیں حق کو باطل پر پھر وہ (حق) اُس (باطل) کا سر پھوڑ ڈالتا ہے پھر وہ (باطل) جاتا رہتا ہے اور تمہارے لیے خرابی ہے، اُن خود ساختہ باتوں کی وجہ سے، جو تم بناتے ہو''۔

اسی دینِ اسلام کے قرآنی معاشرہ میں تمام اقدار مکمل صداقت لیے قرآن میں دے دی گئی ہیں اور اب ان میں تبدیلی کا امکان کی کسی قسم کی گنجائش نہیں ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (6:115)

''خدا کا کلام تمام صداقتوں اور عدل و توازن لیے ہوئے (قرآن میں) مکمل ہو چکا ہے۔ اب اس کلام میں تغیر و تبدل کرنے والا نہیں۔ وہی ہے سننے والا جاننے والا''

اسلامی حکومت کے قیام کی آخری منزل میں قرآن کے مثالی مُطلق اور غیر مُتبدل اصول و اقدار کا نفاذ کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ نظریہ زندگی یعنی مستقل اقدار پر مبنی معاشرہ کا قیام ہے، جس سے پوری نوع انسانی کے حقوق کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔ ان ہی کے متعلق قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ:

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (10:58)

''یہ (مستقل اقدار) بہتر ہیں، ان سب سے جو (انسان اپنی عقل سے) جمع کرتا ہے''

مستقل اقدار میں بلند ترین قدر خود انسانی ذات ہے، جس کے لئے کہا ولقد کرمنا بنی آدم یعنی ''ہم نے انسان کو واجب التکریم بنایا۔ اقدار خداوندی انسان کی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں۔ قرآن کی رو سے انسانی جسم یعنی انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے اپنی اقدار رکھتے ہیں۔ لیکن یہ مستقل نہیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں۔ جب طبیعی زندگی اور انسانی ذات کے مفادات میں تصادم ہو جائے تو انسانی ذات کے مفاد کے تحفظ کے لیے طبیعی زندگی کے مفاد کو قربان کر دینا چاہیے۔ مثالی صورت البتہ یہی ہے کہ ہر شخص کی جسمانی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اسے اس کی ذات کی نشوونما کے پورے مواقع اور اسباب و ذرائع بھی میسر ہوں۔ قرآن نے انسانی ذات کی نشوونما اور حصول خیر کے موجب جن قوانین کو روشناس کرایا ہے وہ غیر متبدل اور مستقل ہیں۔ ہر زمانے، ملک اور حالات کے لیے اور قیامت تک تمام عالمگیر انسانیت کے لیے۔ ان کی مختصر سی تفصیل کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ جو مثالی معاشرہ کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔

1۔ احترام آدمیت

انسانی ذات ہر ایک کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ اس لیے قرآن کی رو سے ہر انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام قرار دیا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) ''یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔''

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے ذات پیدائش کے ساتھ ملتی ہے اور یہی چیز انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی مساوات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ مساوات کا ہمارے ہاں مطلب اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو حق رائے دہندگی دے دیا جائے۔ جس مساوات کی عمارت انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی فرد کی ذات اپنے مفاد کے حصول کے لیے دوسرے کی آلہ کار نہیں بن سکتی یعنی کوئی فرد اپنے مفاد کے حصول کے لیے کسی دوسرے فرد کو بطور ذریعہ استعمال نہیں کر سکتا۔ اسے ہی حقیقی آزادی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا احترام آدمیت ایک مستقل قدر ہے جسے کسی مفاد اور مقصد کی خاطر کسی حالت میں قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ذات پات، حسب نسب اور رنگ نسل کے تمام امتیازات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

قرآن تمام نوع انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) ''ہم نے تم سب کو نفس واحد سے پیدا کیا ہے۔''

قرآن کی بنیادی تعلیم و تکریم کی بنیاد مساوات انسانی ہے ظاہر ہے کہ اس اصول کے ہوتے ہوئے وہ غلامی جیسی انسانیت سوز لعنت کو کس طرح جائز قرار دے سکتا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں پوری دنیا اور بالخصوص عرب جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق حکم دے دیا کہ انھیں بہر حال چھوڑنا ہوگا۔

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (47:4) ''خواہ فدیہ دے کر یا خواہ احسان رکھ کر۔''

یوں قرآن نے ماضی کی غلامی کا دروازہ مستقبل میں بند کر دیا۔ اور موجود غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دے کر ان کو بھی بتدریج رہائی دلوا دی۔ یہ بھی ہدایت دی کہ جب تک وہ قیدیوں کی حیثیت سے تمہارے پاس رہیں گے ان سے انسانیت کا سلوک کیا جائے گا کیونکہ مومن تکریم آدمیت کی مستقل قدر کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

قرآن کریم کی رو سے جنسی تفریق نہ وجہ ذلت ہے نہ باعث امتیاز۔ یعنی نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے عورتوں سے افضل ہے اور نہ ہی عورتیں محض عورت ہونے کی بنا پر مردوں سے کمتر۔ مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبیعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لیے یکساں ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ (46:19)

''ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔''

یاد رہے کہ قرآن جب سب لوگوں سے جمع کے صیغے میں مخاطب ہوتا ہے تو ان میں سب مرد اور عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ اس لیے یہاں بھی جمع کا صیغہ استعمال کر کے عورت اور مرد کو برابر کی سطح پر رکھا ہے۔

اس برابر کی سطح کو مرد اور عورت دونوں کو نکاح میں انتخاب کا حق دے کر بھی کیا ہے۔ تعلق زوجین کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ شادی میں اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق اور مستقل قدر ہے۔ اس لیے مردوں سے کہا ہے کہ:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) ''تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو''۔

دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حق انتخاب کی حفاظت کر دی کہ

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ (4:19) ''تم عورتوں کے زبردستی مالک (خاوند) نہیں بن سکتے۔''

قرآن کی رو سے نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں دونوں میاں اور بیوی کی رضامندی سے شمولیت بنیادی شرط ہے۔

پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔ جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرے گا وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (49:13)

''تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوی شعار (قوانین کی نگہداشت کرنے والا) ہے۔''

عزت وتکریم کا معیار انسانوں کے جوہر ذاتی ہیں نہ کہ اضافی نسبتیں۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ (46:19)

2۔عدل:

تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھنا، ہر ایک کے لیے صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی وعمل کے لحاظ سے ان کے مقامات ومدارج متعین کرنا۔محنت کے مطابق معاوضہ دینا۔کسی کے حقوق وواجبات کو سلب نہ کرنا اور تمام امور کے فیصلے اس قانون کے مطابق کرنا جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو عدل کہلاتا ہے۔جس کے متعلق کہا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (16:90) ''قینا اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔''

یہ ایک مستقل قدر ہے جس کا دامن کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ہاتھ سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔

حتیٰ کہ قرآن کے مطابق جو لوگ ہم سے دشمنی برتیں، ان سے بھی عدل ضروری ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ (5:8)

''کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔''

جس طرح فریقِ مخالف کے بچے کو بھی انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم سمجھا جائے گا۔اسی طرح دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔

3۔جان کی حفاظت:

انسانی جان کی حفاظت میں قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ (6:151)

''اور مار نہ ڈالو اس جان کو، جس کو حرام کیا اللہ نے، مگر حق پر۔''

خدا نے انسانی جان کو واجب التکریم قرار دیا ہے، اس لیے کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔اگر حق کا تقاضا ہے تو ایسا کیا جاسکتا ہے۔حق کے تقاضے سے مراد قرآن سے درج ذیل آیت سے وضاحت ملتی ہے کہ:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (5:32)

''جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلاعوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کردیا سب لوگوں کو۔''

یہاں قتل کرنے کی وجوہات بیان کردی گئی ہیں۔

1۔ اگر کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے تو اس جرم کی پاداش میں اسے عدالت کی طرف سے سزائے موت دی جاسکتی ہے۔

2۔ اگر کوئی شخص معاشرے کے نظام عدل و امن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے اور کسی طرح اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے تو اسے بھی سزائے موت دی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا پوری نوع انسانی کو تلف کر دیا۔ اس کے برعکس جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھ لیا جائے گا گویا اس نے پوری نوع انسان کی جان بچالی۔

قانون کی دانستہ خلاف ورزی جرم کہلاتی ہے۔ چونکہ اس سے نظام عدل ٹوٹ جاتا ہے اس لیے اس ذہنیت اور اس قسم کے اقدام کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس روک تھام کو جرم کی سزا یا قصاص کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں مجرم کا پیچھا کر کے اسے اس کے کیے کا بدلہ دینا۔ قرآن کی رو سے قصاص میں نوع انسانی کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:179)

''اے صاحبان عقل و بصیرت! تمہارے لیے قصاص میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے تاکہ تم قانون کی اچھی طرح نگہداشت کر سکو۔''

لیکن سزا ہمیشہ بااندازہ جرم ہونی چاہیے۔ جو لوگ ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں پیدا کریں اور اپنے کیے پر نادم ہوں ان میں اصلاح کا امکان نظر آئے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (42:40)

''لیکن وہ شخص (مجرم میں ندامت کے آثار دیکھ کر) اسے معاف کر دے اور اس حسن سلوک سے مجرم کی اصلاح کرے تو ایسا کرنے والے کو قانون مکافات کی رو سے اس کے حسن عمل کا صلہ ملے گا۔''

4۔ اپنے اعمال اور محنت کی جزا:

عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ جرم کی سزا مجرم کو ملے۔ یہ نہیں کہ جرم کوئی کرے اور سزا کسی اور کو دی جائے۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (6:164)

''اور جو جرم کرے گا اس کا وبال اسی پر پڑے گا کسی اور پر نہیں۔ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔''

یہ اصول اس قدر جامع ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ خیر و شر کے معیار کا یہی اصول بھی ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (39:70)۔ ''ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔''

قرآن نے اس کی وضاحت میں کہا ہے کہ

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) ''کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہ کر سکے گا۔''

اس قسم کے معاشرہ میں ایسے طبقہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کا استحصال نہیں کر سکے گا تو ہر کام کرنے والا، اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہوگا۔ اس سلسلے میں قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ جو کام کرنے کے قابل ہونے کے باوجود دوسروں کی محنت کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ گداگر ہے۔ خواہ کتنا ہی بڑا دولت مند کیوں نہ ہو۔

5۔ ظلم کا خاتمہ (امن کی ضمانت):

جب عدل اس قدر عظیم اصول اور قانون ہے تو ظاہر ہے کہ ظلم جو عدل کی نقیض ہے کس قدر ناروا ہوگا۔ اس باب میں قرآن نے صرف اتنا ہی کہا کہ تمہیں کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ کہ کسی کو اپنے آپ پر ظلم کرنے کی توفیق بھی نہیں دینی چاہیے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (2:279) ''نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی اپنے آپ پر ظلم ہونے دو۔''

نہ صرف تمہارے خلاف بلکہ کسی کمزور اور ناتواں کے خلاف بھی نہیں۔ اس کے لیے اگر جنگ کرنے کی ضرورت پڑے تو قرآن اس کی بھی اجازت دیتا ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ (22:39) ''ظالم جن مظلوموں کے خلاف آمادہ پیکار ہو رہے ہیں انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ وہ بھی ان کے خلاف میدان جنگ میں نکل آئیں۔ اس لیے ان پر ظلم ہو رہا ہے۔''

خود ظلم نہ کرنا اور ظلم کی روک تھام کرنے والے معاشرہ میں قرآن کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ وہاں۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) ''لوگوں کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔''

خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نام ہے لہٰذا اس معاشرہ میں ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہوگا اور حزن اس افسردگی کو کہتے ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں اس معاشرہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افراد معاشرہ بیرونی خطرات سے امن میں رہیں۔ وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ ان پریشانیوں کو دور کرے جو لوگوں کے لیے وجہ افسردگی بنتی ہیں۔ یہ ہے ظُلم کا خاتمہ اور امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا حصول ہر فرد معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔

6۔ احسان:

احسان کے معنی ہیں حسن پیدا کرنا۔ حسن توازن ہی کا دوسرا نام ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (16:90) ''یہ حقیقت ہے کہ اللہ تمہیں عدل اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے۔''

عدل، بدلے اور معاوضے کا متقاضی ہوتا ہے۔اس میں دوسروں کے واجبات ادا کیے جاتے ہیں۔لیکن احسان میں بدلے اور معاوضے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ احسان کے بدلے کی آرزو اس مستقل قدر کی نقیض اور غیر قرآنی تصور ہے۔اس میں نقطہ نگاہ یہ ہونا چاہیے کہ:

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9) ''ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں، نہ شکریہ۔''

واضح رہے کہ قرآنی نظام قائم ہوجانے کے بعد یہ احسان (کمی کا پورا کرنا) خود نظام کی طرف سے ہوگا۔

یہاں اللہ کا حکم ہے کہ اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔عدل کے معنی ہیں برابر کر دینا۔جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ دے دینا اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔اس سے ان کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔جن کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو۔ان دونوں مستقل اقدار کا برقرار رکھنا قرآنی معاشرہ کا فریضہ ہے۔وہ ضمانت دیتا ہے کہ:

1۔جو لوگ اپنی ضروریات سے زیادہ کما سکیں ان کے لیے مستقل قدر یہ ہے جیسا کہ متعلقہ عنوان میں وضاحت کی جائے گی کہ جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو، وہ اسے دوسروں کی نشوونما کے لیے کھلا رکھیں۔

2۔جو لوگ محنت سے معذور ہو چکے ہوں، وہ دوسروں کی فاضلہ دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے اور اسے بطور مستقل قدر پیش کرتا ہے۔

3۔جو محنت کریں، ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دے کر ان پر ظلم روا نہیں رکھتا۔لہذا جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو، ان کی کمی کا پورا کرنا بھی مستقل قدر ہے۔

یہ تمام مندرجہ بالا انتظام اسلامی مملکت کے ہاتھوں سے ہوگا، لیکن جب تک نظام قائم نہ ہو، یہ فریضہ متمول افراد کو ادا کرنا ہوگا۔نظام کے اندر بھی یہ فریضہ افراد ہی کی طرف سے ادا ہوتا ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے اور بالواسطہ۔

7۔کوئی کسی کا غلام اور محکوم نہیں ہوسکتا (حق آزادی):

احترام آدمیت کا لازمی نتیجہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام یا محکوم نہ ہو۔ہر ایک کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہو۔قرآن کا اس بات میں واضح فیصلہ ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میرے غلام اور محکوم بن جاؤ۔''

قرآنی معاشرہ میں نہ کسی عدلیہ کو اس کا حق حاصل ہے اور نہ ہی گورنمنٹ کو کہ کسی فرد یا معاشرہ کو اپنی مرضی کے تابع چلائے اور نہ ہی مذہب کی دنیا میں (اور تو اور) کسی نبی تک کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا مطیع فرمانبردار بنائے۔

ہر فرد کی آزادی اور اس آزادی کا احترام ایک بنیادی مستقل قدر ہے جسے کسی حالت میں بھی پامال نہیں کیا جا سکتا۔

8۔ قانون کی اطاعت:

لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی معاشرہ اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا اور نہ باقی رہ سکتا ہے جب تک افراد پر کچھ پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رو سے عائد ہوں گی اور اس قانون کی اصولی حدود وحی کی رو سے خدا کی طرف سے متعین ہوں گی۔ چنانچہ اوپر کی آیت کا بقیہ حصہ یوں ہے۔

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)

''اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم سب ربانی (خدا کے نظام ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔ اس ضابطہ قوانین کی رو سے (جو تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے) جس کی تم ایک دوسرے کو تعلیم دیتے ہو اور اپنے دلوں پر منقوش کرتے رہتے ہو۔''

اس قانون کا اطلاق ہر فرد معاشرہ پر یکساں طور پر ہوگا اور کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگی حتیٰ کہ رسول بھی اسی حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (46:9) ''میں اس کے سوا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے اور کسی چیز کا اتباع نہیں کرتا۔''

یوں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم اور غلام نہیں ہوتا۔ متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتاب خداوندی کی رو سے ہوتے ہیں جس کا اطلاق سب افراد پر یکساں ہوتا ہے۔ عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص حکومت کی ملازمت اختیار کرتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ اس کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہوں گی اور اس کے حقوق اور واجبات کیا۔ اسلامی نظام حکومت میں ''ملازم'' اور آقا کا تو سوال ہی نہیں ہوگا۔ وہاں سب ایک دوسرے کے رفیق و مددگار اور ایک مشینری کے پرزے ہوں گے۔ وہاں ''افسری اور ماتحتی'' کی شکل نہیں ہوگی بلکہ کام کی تقسیم کے اصول کے مطابق مختلف لوگوں کے سپرد مختلف کام ہوں گے۔ ان میں سے ہر شخص کو بتایا جائے گا کہ تم ایک ایسے نظام کے کارندوں میں شامل ہو رہے ہو جو اس صداقت پر قائم ہوا ہے کہ:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ''حاکم ہونے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنے تمام فیصلوں میں ان قوانین کو سامنے رکھنا ہوگا جو اللہ کی طرف سے قرآن کریم میں دیے گئے ہیں اگر تم ان کے مطابق فیصلے نہیں کرو گے تو تم اپنے آپ کو اسلامی معاشرہ کا فرد نہیں کہلا سکتے۔ اس لیے کہ لا اِلٰہ الا اللہ کا عملی مفہوم یہی ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا محکوم اور تابع فرمان (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)

''جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ کافر ہیں''۔

قانون خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا مستقل قدر ہے۔

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیر قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بجھوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 20000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المومنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 7

By G. A. Parwez (Episode No.1)
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is February 26, 1982 and today's lecture starts with verse (47:34) of Surah Muhammad (محمّد).

If you remember, the previous verses that we covered in the last lecture dealt with the struggle between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل). This struggle has been going on throughout human history and will continue until eternity. Iqbal expresses this Quranic reality thus:

This perpetual struggle has always existed
Amid Muhammad's light and Abi Lahab's fire

The Quran recognizes only two groups, only two nations, only two parties in the world – one that accepts the Quran as *the* guidance for humanity and believes in Prophet Muhammad (PBUH) as His last Messenger; and the other which does not. By the way I could mention here that this principle of the Quran was the basis of our two-nation theory and hence the demand for Pakistan. The other group was opposed to this principle. The opposition forces form the other group. It does not mean that this opposition group necessarily fights in the battlefield. It means also that this group does not accept this principle as true, and it openly challenges this truth and engages in transgression against this principle.

If you remember, in many of these lectures, I had mentioned that one does not necessarily become a مومن (*Momin*) by being born in a Muslim family. One has to act upon the requirements to be a مومن (*Momin*). The Quran asks Muslims: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ (4:136) – O you who profess to believe! Hold fast unto your belief in Allah, His Messengers, the Book which He has sent to this Messenger, and those which He had sent earlier. This has to be done practically in order to be part of the first group. Every child by birth is neither مومن (*Momin*) nor کافر (*Kafir*). The child is born as a human being. Later he needs to choose one of this two ways by his own freewill with full acceptance of his heart and mind. The Quran uses verb for these two ways: whether one *acts* as believer (**آمنو**), or whether one *acts* as a disbeliever (**کفرو**).

We saw in the last lecture what it means by obeying Allah and obeying the

Messenger: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّـهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – O who you claim to believe! You must follow and obey the Divine System that the Messengers has established, in its entirety. Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. However, Abul Kalam Azad propagated a Brahmo Samaji version of Islam. He said that, anyone (belonging to any religion) who leads a virtuous life and worships God then the goal of Islam is achieved. The question is: what is virtuous life? In Hindu religion it is individual charity, e.g., keeping some salt and water for animals is a virtue. But this is not true in Islam. Islam requires Iman first. Doing individual worship and doing individual charity is not what Islam is about?

Life has a serious purpose

To have Iman in Allah is a positive action. In reality, it is a change in mindset. It is this foundation what we call Iman on which the structure of دین (*Deen*) – the way of Divine life – is erected. It is fountainhead of willpower; it is the goal that determines the destination; it is the kernel of life's decision making ability. It is the essence of Iman around which life revolves. Everything that is done according to it is a virtuous action. Anything that is against it is bad and evil. So, it requires obedience to the divine laws – now contained in the Quran – that takes humanity to the proper destination. This is where the دین (*Deen*) wants to take us. This is the path on which are our Prophet's shining steps to guide us. This is the path that takes us to the correct destination. This is called Islam. Contrary to this, religion takes us away from the path of دین (*Deen*) and all efforts go to waste: حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (2:217). Obviously, if one takes a wrong turn and continues then one gets further and further away from destination and one's efforts get wasted. Journey without destination is vagrancy. This is the way of religion. Every religion, on its own, thinks that it is doing pious work on individual basis. This is not what Islam teaches. Islam is a collective system that requires collective obedience of Divine Laws contained only in the Quran and nowhere else.

The difference between Quranic society and secular society

My dear friends, what we call secularism, it is a system in which people just don't talk the talk but also walk the talk, spend time and effort, and get tired – but the result of this is not what takes humanity to the proper destination. Therefore: وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. Please notice here that this is not something to be done individually. This is a system of life whose obedience is to be done in order that the caravan of life reaches its destination. Contrary to this: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّـهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ اللَّـهُ لَهُمْ (47:34) – If those who deny the Divine Laws and obstruct others from adopting the Divine Order do not change their ways and die while continuing doing so, they will never be protected from the adverse consequences of their erroneous deeds. Therefore, if one is not punished in this world, it does not mean that he is saved from retribution. The consequences of one's deeds have to be faced after death. The first group (described earlier in verse 47:33) is traveling to the correct destination – but the second group

not only does not accept that destination but even put roadblocks in the path of the first group. And thus these second group commits two crimes: First, they themselves are not traveling to the correct destination and second, they are putting roadblocks in the path of those who are traveling to the correct destination.

The religious and spiritual roadblocks in the path of Quranic society

My dear friends, the Quran clearly identifies who are the people who put roadblocks in the path of Allah: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (9:34) – O Believers! A good many of the spiritual leaders and religious priests devour others' property and turn them away from Allah's path. There are others who hoard gold and silver and do not keep it open for use in the way of Allah. For both are tidings of grievous chastisement. On the Day of Reckoning, the gold and silver will be heated in the fire of Jahannam and their foreheads, sides and backs will be branded therewith, and it will be said to them: "This is what you had treasured up for your exclusive use and deprived the needy of it. Taste then your treasures which you had amassed."

Regarding the religious and spiritual leaders the Quran clearly says that they thrive on other people's wealth and do not work themselves. This is their first crime. The next thing the Quran mentions above is about capitalists. What is a capitalist? The Quran defines them as people thrive on other people's hard work just by investing money. Among the capitalists the biggest group is these religious and spiritual leaders because they thrive on other people's effort without investing even a penny. Therefore, there is no risk at all unlike those capitalists who invest money. What could be more profitable business than this my friends? Not only that the very people who provide them sustenance also plead with them to accept their offerings; serve them with all their with their heart and soul; listen calmly to their angry words and keep pleading to them in prayers, and so on and so forth…

Our credulity to believe religious and spiritual scholars in spite of Quran's warning

Whenever religious scholars explain any Quranic verse, they start with what is called "Shaan-e Nuzul" or reason for its revelation. Then they start telling that such and such verse is about Jews; that such and such verse is about Christians; that such and such verse is about the Mushriks of Quraysh etc. When questioned: Well, is there anything about us too? Yes, of course, there is they tell us: Jannah is for us. But the Quran is addressing Muslims: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (9:34) – O Muslims believers! A good many of your spiritual leaders and religious priests devour people's wealth and turn them away from Allah's path. And: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (9:34) – There are others who hoard gold and silver and do not keep it open for use in the way of Allah. O Prophet (PBUH) announce: فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (9:34) – For both are tidings of grievous chastisement. And: فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (47:34) – they will never be protected

from the adverse consequences of their erroneous deeds.

The struggle between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) had been going on throughout human history. Every page of the Quran reflects the story of this struggle in one form or the other describing the many challenges that happen in the course of this struggle. The Prophet (PBUH) and the مُؤْمِنِين (*Momineen*) had to deal with more or less eighty two battles in Medina during the ten years of the Prophet's life. Then the Quran tells the مُؤْمِنِين (*Momineen*) to remain steadfast in the ongoing battle: فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (47:35) – Now that war with these opponents is imminent, do not be disheartened and do not minimize your struggle (because of activities of the hypocrites); nor call for peace by considering yourself weaker and subdued. Rest assured that you shall overcome them due to the support and assistance provided by Divine Laws. He shall never reduce the consequences of your efforts. He will never let you down.

A golden rule in battlefield

The Quran ordered the مُؤْمِنِين (*Momineen*): if the enemy surrenders during a battle – even though you may have the upper hand and about to win – then accept the overture of peace. Do not presume that the enemy is tricking you although that may be the case. Regardless, you give the benefit of doubt and accept the surrender. If it turns out that this was a trick then be always prepared to fight back. This is a message for humanity's benefit. If they were honest in making peace and you killed them thinking they were tricking you then this will be a crime against humanity. On the other hand, you do not make peace overture to an enemy because the enemy will exploit you and think that you are weak. This will create inflection in their hearts and they will take advantage of you.

The Quranic order will never let مُؤْمِنِين (*Momineen*) down

Quran states: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ (47:35) – Rest assured that ultimately you shall dominate them; that you will be victorious. هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (48:28) – This is because Allah has sent his Messenger with the Divine Code, which is a system based on absolute truth. It can thus overcome all other manmade systems. This can only happen if the مُؤْمِنِين (*Momineen*) become powerful and strong enough to wipe out the false systems based on injustice and establish the Divine Order instead. وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (3:139) – O party of مُؤْمِنِين (*Momineen*)! Do not lose heart nor be depressed for you shall surely dominate, provided you are true believers. My dear friends, please note that this is being told about مُؤْمِنِين (*Momineen*) not us, born Muslims, because as we saw Allah is asking us also to acquire Iman! Considering oneself as **مومن** (*Momin*) by being born in a Muslim family is a great delusion. The Quran puts the condition of being مُؤْمِنِين (*Momineen*) as those over whom the unbelievers will never have domination.

A great lesson from a prisoner in the court of 'Umar (R)

We have the illusion that we are مُؤْمِنِين (*Momineen*) but every group in the world dominates over us whereas Allah says that no one can dominate مُؤْمِنِين (*Momineen*)

because وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ — Allah is with them. What it means that Allah is with the مُؤْمِنِين (*Momineen*), my friends? If you remember I often repeat the story of Harmuzan (the Iranian governor) who was brought back to Medina as prisoner of war after Iran was defeated during Khalifa Omar's caliphate. Omar (R) asked him: Before, you used to dismiss Arabs and you even felt beneath your dignity to fight them. So, what happened this time? What was the reason that Iran lost the war and its ruler was running around seeking shelter and was killed by a water wheel under which he was hiding? Harmuzan replied: When we fought the Arabs before, there were Arabs one side and the Iranians on the other side. It was not difficult for us to defeat the Arabs. But now the Arabs and their God are on one side and we Iranians are on the other side. What to say Iran even the whole world cannot defeat them. My dear friends, Harmuzan knew what it means: وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ – That Allah is with you.

Allah is with those who chart their destination of life according to the Quran and proceed fearlessly towards it. In fact, Allah says: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) – He is with you wherever you happen to be. Since Allah is everywhere so why the emphasis especially in the fight between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل)? Because: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ (47:35) – Be assured that you shall dominate because Allah is with you. Since your caravan is proceeding on the most balanced and straight path – الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ – under the guidance of Allah, so, He is with you. Because you have synchronized your will with the Will of Allah: وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (47:35) – Rest assured that you shall overcome forces of FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) due to the support and assistance provided by Divine Laws. He shall never reduce the consequences of your efforts. He will never let you down.

So, we have this group that has only the material interests as its goal. There is no higher goal in front of it. The Quran says that this kind of life is a life at the animal level. This is the life of secularism; this is the life of Kufr. This group enjoys material things, indulges in comforts of life, and dies. The other group thinks that material things are only the means to achieve a higher goal. And that higher goal is the establishment of دین (*Deen*) in this world that will place the caravan of humanity on the road that has been set by Allah. In secular life one is always afraid of death. Even a lowly ant fights obstacles in its path in order to survive. Preservation of self is demand of inner life. Life wants its protection. This is fundamental thing, and up until this point, the life of Momin and the life of Kufr share this common part. But, then comes the difference between the two lives.

Difference in the concept of life of Momin and Kafir

Yes, it is important to preserve the physical life by all means. But death is not the end of life. Death only destroys the physical life. However, a Momin is one who gives his physical life for the sake of THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) during fight between TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) in order to achieve eternal life. The Quran says that Kafir is afraid of death but, you O Momin, embrace death

for the sake of *Al-Haq* (الحق). Do you see my friends, the extremely contrasting difference between the two mindsets? The Quran told this in few words. The Quran opens the door for a Mujahedin to achieve eternal life. History cannot provide any similar examples of the miraculous victories that were achieved in battles during the Prophet's life and the rightly-guided Khalifas. Allah's Mujahedin fight for the establishment of the system of universal sustenance that fulfils people's needs including that of Mujahedin's family. But the Kafirs fight for material wealth and power under auspices of capitalists who exploit them. And they are always afraid of death because they worry about what will happen to their families if they die. The mujahedin, on the other hand, fight with their heart and soul with conviction that death will open the door for eternal life, and therefore they are not afraid of death. The Quran offers glowing tribute to them: إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۚ وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (47:36) – Also remember that your aim should not be gains of this worldly life. You should keep your attentions focused on the sublime and permanent values of life. Worldly life and its gains are nothing more than a mere play and passing amusement. If you have firm faith in this reality, and in conflict between worldly gains and any permanent value if you guard the permanent value, then the Divine Law of Requital will grant you full reward for your efforts without asking for anything in return. Therefore, at this juncture, you should contribute whatever you can for the establishment of Divine Order. All this will be returned manifold to you.

Also, the Quran demands يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ (47:33). That means it is not a question of believing once but believing at every step of life at every moment. If we take a step towards the destination then after every step we get closer to the destination. Therefore we must protect ourselves – وَتَتَّقُوا (47:36) by taking the proper turn at each crossroad under the eternal guidance of divine laws. If at any crossroad the traveler takes a wrong turn then each step takes him further away from the destination. So, the divine guidance will tell the traveler that you have taken a wrong turn and he immediately returns to the crossroad from where he took the wrong turn. This is called **توبہ** (*Tauba*).

So, **توبہ** (*Tauba*) is an action, not reciting the words, "O Allah **توبہ** (*Tauba*)". It is going back to where one took the wrong turn. This is called **تابہ** (*Taaba*). But just returning there is not enough. After returning there one has to move forward towards the destination. This is called **اصلح** (*Asla'ha*). In the Quran **تابہ** (*Taaba*) and **اصلح** (*Asla'ha*) always come together. If there is no time for **اصلح** (*Asla'ha*) then **تابہ** (*Taaba*) is meaningless. If you keep doing **تابہ** (*Taaba*) and **اصلح** (*Asla'ha*) then the Quran says your efforts will keep on producing good result. يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ (47:36) –Then the Divine Law of Requital will grant you full reward for your efforts without asking for anything in return.

Next the Quran reminds Muslims: وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (47:36) – Remember that at this juncture, the Prophet is trying to establish the divine order; he is trying to establish the divine government. In order to do this funds will be needed. Therefore, you

should contribute whatever you can for the establishment of Divine Order. This contribution of yours will be considered as the best loan (**قرض حسنہ**) that you give to Allah. This will be returned manifolds to you. This is like sowing one grain which produces seven hundreds grains. This will not be interest but the result of hard work.

The issue is very clear: every new system that is formed requires resources. Initially, the resources are spent in establishing the infrastructure and welfare institutions for the people. When this is done the system generates so much wealth and resources that it will be many times more, beyond your expectations; beyond your calculations; even beyond your comprehension. And the succeeding events in the life of Prophet (PBUH) and rightly-guided Khalifas proved that it did happen beyond human calculations. During Khalifa's 'Umar (R) rule the Islamic state expanded exponentially to more than two million square miles and the material resources increased beyond expectation so much so that even Khalifa 'Umar was surprised from the total tax revenue collected by Governor Abu Hurairah from his province.

Next the Quran says: إِن يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ (47:37) – If the Divine Order demands something from you in order to establish itself, you might be hesitant to part with your material possessions. If such demands kept forthcoming, then you would niggardly cling to them, out of sheer disgust, and so, you may say whatever is concealed in your heart. Unlike other manmade systems, keep in mind that this divine order will not adopt such a course of action as whatever it demands is for your own benefit. Hence give to it willingly.

The law of succession and substitution of nations

My dear friends, we now come to the last verse of Surah Muhammad (محمّد). For the second time we have come to the 26th Parah (**جز**) of the Quran. The Quran describes the law of rise, fall, and demise of nations again and again. It describes how the substitution of one nation occurs with another nation. Apart from natural disasters that totally destroy smaller nations, the Quran also describes how a nation enslaves another nation; how a nation destroys another nation and takes over.

Listen my dear friends, how the Quran addresses the مُؤْمِنِين (*Momineen*): هَا أَنتُمْ هَـٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (47:38) – But some amongst you act miserly when asked to keep their wealth open for the Divine Order. They should know that the one who is miserly in this matter in fact harms none but himself, for Allah is indeed magnificent. Allah does not need you to give Him anything. It is for your growth that you need His system. Should you turn back from your commitment, He will replace you with another nation which will not be like you! This is so because the law for life, death and supremacy amongst nations is that only the nation with the correct system of life survives. Those nations which have a wrong system are destroyed and replaced by another nation that has a better system. The decisions about life and death of nations are taken in light of their ideologies and practical implementation of their program.

To be Continued

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں؛ انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو؛ جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

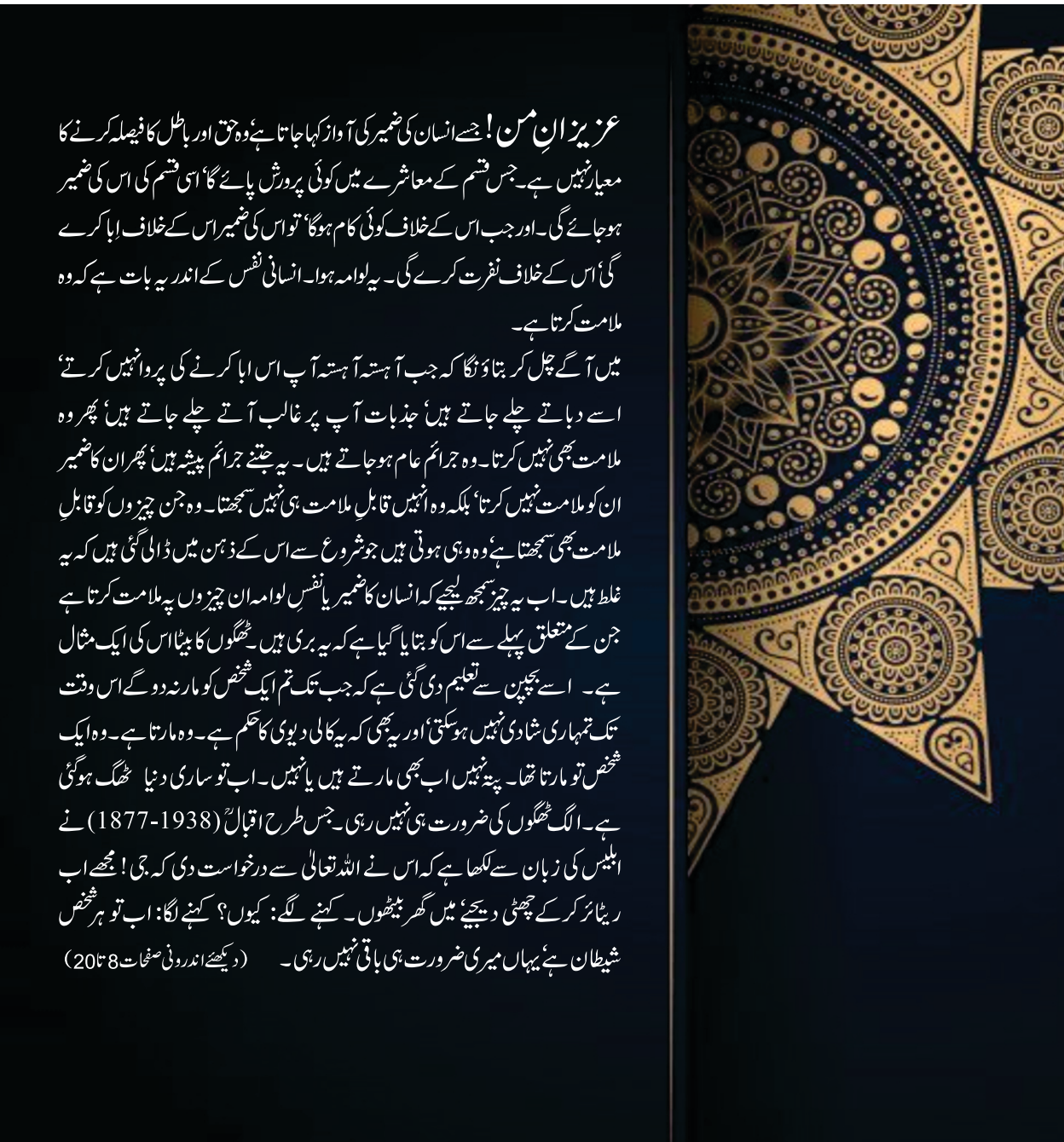
(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
01

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



عزیزانِ من! جسے انسان کی ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے، وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کا معیار نہیں ہے۔ جس قسم کے معاشرے میں کوئی پرورش پائے گا، اسی قسم کی اس کی ضمیر ہوجائے گی۔ اور جب اس کے خلاف کوئی کام ہوگا، تو اس کی ضمیر اس کے خلاف ابا کرے گی، اس کے خلاف نفرت کرے گی۔ یہ لوامہ ہوا۔ انسانی نفس کے اندر یہ بات ہے کہ وہ ملامت کرتا ہے۔

میں آگے چل کر بتاؤنگا کہ جب آہستہ آہستہ آپ اس ابا کرنے کی پروا نہیں کرتے، اسے دباتے چلے جاتے ہیں، جذبات آپ پر غالب آتے چلے جاتے ہیں، پھر وہ ملامت بھی نہیں کرتا۔ وہ جرائم عام ہوجاتے ہیں۔ یہ جتنے جرائم پیشہ ہیں، پھر ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا، بلکہ وہ انہیں قابلِ ملامت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ جن چیزوں کو قابلِ ملامت بھی سمجھتا ہے، وہ وہی ہوتی ہیں جو شروع سے اس کے ذہن میں ڈالی گئی ہیں کہ یہ غلط ہیں۔ اب یہ چیز سمجھ لیجیے کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوامہ ان چیزوں پہ ملامت کرتا ہے جن کے متعلق پہلے سے اس کو بتایا گیا ہے کہ یہ بری ہیں۔ ٹھگوں کا بیٹا اس کی ایک مثال ہے۔ اسے بچپن سے تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم ایک شخص کو مار نہ دو گے اس وقت تک تمہاری شادی نہیں ہوسکتی، اور یہ بھی کہ یہ کالی دیوی کا حکم ہے۔ وہ مارتا ہے۔ وہ ایک شخص تو مارتا تھا۔ پتہ نہیں اب بھی مارتے ہیں یا نہیں۔ اب تو ساری دنیا ٹھگ ہوگئی ہے۔ الگ ٹھگوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جس طرح اقبالؒ (1877-1938) نے ابلیس کی زبان سے لکھا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست دی کہ جی! مجھے اب ریٹائر کرکے چھٹی دیجیے، میں گھر بیٹھوں۔ کہنے لگے: کیوں؟ کہنے لگا: اب تو ہر شخص شیطان ہے، یہاں میری ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ (دیکھئے اندرونی صفحات 8 تا 20)